سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ

دیوان طباطبائی

یعنی

صوت تغزل

۱۹۳۳ء

مجموعہ کلام

نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر طباطبائی نظمؔ

ناشر

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن

۱۹۳۳ء
۱۳۵۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادب الکاتب و الشاعر

غزل

تمام دنیا کی شاعری میں مضمون پہلے مقرر ہو جاتا ہے پھر اس مضمون کے مناسب قافیے اختیار کئے جاتے ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف شعر ایران میں ایجاد ہوئی جس میں مضمون سے پہلے قافیہ و ردیف مقرر کر لیتے ہیں پھر اسی قافیہ و ردیف کے مناسب مضامین اختیار کرتے ہیں۔

قافیہ و ردیف کی تعیین یا چوسر کے پانسے ہیں چھکا بھی نکل آتا ہے پو بھی آتی ہے۔

یہ دو لوہیں ہیں جن سے مضمون کا طلسم کھل جاتا ہے۔

دومیل راہ میں جو مضمون کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ جو شخص پتہ کو سمجھ جاتا ہے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ نہیں تو بھٹک کر گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔
غزل گو قرعہ پھینکتا ہے اور اس کی قسمت کا جو سہم ہے نکل آتا ہے۔
قافیہ ورد یف دو پر پرواز ہیں جس سے کبھی غزل گو عرش تک پہنچ جاتا ہے اور خزانۂ عرش سے مضمون اڑا لاتا ہے۔ سہ

لے گئی عرش معلی پہ مجھے فکر سخن
جا پڑا پر تو آئینۂ زانو ہو کر

اس کے علاوہ ردیف میں محاورے کی شوخی پیدا کرنا سننے والوں کے دل کو بے چین کر دیتا ہے مرزا داغ مرحوم کو اس باب میں ید طولی حاصل تھا۔

(لگی ہوئی) ردیف ہے اس میں داغ نے یہ شعر نکالا سہ

جب میں نے آہ کی ہے قیامت اٹھائی ہے
آواز پہ ہے شورش محشر لگی ہوئی

(کچھ بھی نہیں) ردیف ہے اس میں یہ شعر نکالا سہ

معلوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہی دوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ دکا ردیف ہے اس میں زبان کا
مزہ دیکھیے ؎

اٹھنا ہی اسکی بزم سے دشوار تھا مجھے
اور پھر سنبھالیا دل بے اختیار کا

شعر کی ان دونوں صنفوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صنف میں عروض کا
یک وزن ہونا کافی ہے جو قریب قریب موسیقی کا ایک وزن ہوتا ہے
افیہ کا ہونا ہونا زبان کی ساخت پر منحصر ہے۔ اور اس جدید صنف میں وزن
بھی قافیہ بھی بلکہ ردیف کا بھی ہونا ضرور ہے معنوی اعتبار سے دونوں
ں بڑا فرق یہ ہے کہ اوس میں تسلسل ضرور ہے اور اس میں قافیہ و ردیف
رستہ بتائے غزل گو کو اسی طرف جانا چاہیے مثلاً محمل کا قافیہ شاعر کو سجد
طرف لے گیا اور بسمل نے اوسے مقتل کی طرف کھینچا اس وجہ سے مسلسل
زل میں تسلسل باقی نہ رہا۔ اور تسلسل نہ ہونے سے شعر کی وہ خوبیاں جو
ن کے ساتھ مخصوص ہیں غزل سے فوت ہوگئیں مثلاً [illegible]
نعت الگ رہا ہے بلکہ [illegible] نے اس مقام کو یوں ادا کیا ہے

[illegible]

[illegible]

یعنی شرم نے منہ سے بات نہ کرنے دی تو شوق نے پاؤں کی حرکت سے کام لیا اور شرم پر غالب آ گیا (۲) یا جیسے دو شاہزادے عون و محمدؑ شہادت کے شوق میں نکلے ہیں دونوں بھائیوں نے ساتھ ہی یزید کی فوج پر حملہ کر دیا ہے تلواریں مارتے ساتھ ساتھ بڑھے چلے جا رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں دونوں کے درمیان حائل ہو گئیں۔ اب بھائی سے بھائی جدا ہو گیا ہے اس مقام پر دونوں کے یکا یک مل جانے کو میر انیس یوں فرماتے ہیں ؎

وہ شیر سا پہنچا جو ادھر یہ ادھر آیا
جان آ گئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

یعنی قاتلوں کے نرغہ میں آ جانے سے ایک کو ایک کی صورت دیکھنے سے یاس ہو گئی تھی (۳) یا مثلاً حر کی آمد میں فرماتے ہیں ؎

برچھیوں اڑتے ہے دب جاتے فرس نوں سے
آنکھ لڑ جاتی ہے دریا کے نگہبانوں سے

گھوڑے کا اوڑنا اور دریا کا نظر آ جانا یہ مضمون تو میر صاحب کا حد اعجاز کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ لڑ جانے میں یہ معنی ادا کئے ہیں کہ تم نے پانی تو بند کیا ہے اب ہشیار ہو جاؤ میں آتا ہوں۔
غرض مسلسل مضمون میں ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ شاعر کو

ایسے موقع بھی مل جاتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں بہت سے معنے اور بہت سی باتوں کو ادا کردے۔ غزل گو کو دو مصرعوں میں ایسا میدان کہاں مل سکتا ہے۔ اب ثابت ہو گیا کہ غزل گو شعر کی اس خوبی سے محروم رہتا ہے جسے طلسم یا سحر یا اعجاز کہنا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ ایسا سماں باندھ دینا جس میں شاعرانہ جادو جگا سکے بڑے بڑے سخن سنجوں کو بھی شاذو نادر نصیب ہوتا ہے لیکن غزل گو کے لئے تو ممکن ہی نہیں

آخر سیدھا رستہ چھوڑ کر

الٹی چال چلنے کا باعث کیا ہوا

سبب اس کا مشہور ہے کہ مبتدی اس قابل نہیں ہوتا کہ شاعرانہ مضمون سوچ کر نظم کر سکے آسانی کے لئے قافیہ و ردیف اسے بتائے جاتے ہیں۔ اب قافیہ کو ردیف کے ساتھ ربط دینے کے لئے اوسے مختصر سا مضمون سوچنا پڑتا ہے۔ جو دو مصرعوں میں تمام ہو جائے مثلاً فرہاد و بہزاد و صیاد قافیہ ہو تو وہی کوہکن و مصوری و صید افگنی کا مضمون سامنے آئیگا۔

محمل و بسمل و منزل قافیہ ہو تو محمل لیلیٰ کی طرف اشارہ کرے گی بسمل قاتل کا پتہ بتائے گا اور منزل کے لئے تو جادہ پیش پا افتادہ ہے غزل گو کہے ہوے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے اور فخر اس بات پر

کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ لباس نو میں ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے ایجاد کا دوسرا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ معانی کو نئی نئی صورتوں میں دکھانے کی مشق پیدا ہو جائے۔

اس قیاس کے صحیح ہونے کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں غزل ایجاد ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں فن بلاغت کی تدوین و تہذیب ہو رہی تھی۔

پہلے شیخ المعتز باللہ نے جو متوکل و معتصم عباسی کا معاصر تھا البیان والتبیین کے نام سے ایک مختصر سی کتاب شائع کی جو آجتک گویا درس میں جاری ہے۔

پھر امام عبدالقاہر جرجانی نے اسرار البلاغۃ لکھ کر آنکھوں پر سے پردے اٹھا دئے اور دلائل الاعجاز کی تالیف سے قرآن کے وجوہ بلاغت کو بے نقاب کر دیا۔

انھوں نے جو موتی اوگلے تھے وہ بکھرے ہوئے تھے علامہ سکاکی نے کو ہر شناہوا چن چن کر ایسی ایسی لڑیاں گوندھیں کہ فن کی تہذیب و ترتیب اس سے بہتر ہو نہیں سکتی۔

پھر بھی بعض علماء نے سکاکی پر دقیق نظر ڈال کر متن کو زیادہ منقح کر دیا۔ اسکی سیکڑوں نقلیں ہوئیں اور بلاد اسلام میں جا بجا درس

ہونے لگے۔

آخر میں فاضل تفتازاں نے بذل جہد کر کے اس متن متین پر شرحیں
لکھ ڈالیں اور اسکے فیض کو عام کر دیا عرب سے لے کر ہندوستان و سمرقند سے لے کر
جرجان تک معانی بیان کے درس جاری ہو گئے۔

اس فن کے پڑھنے سے اعجاز قرآن واضح ہوتا ہے اس سبب سے
فن بلاغت جزو مذہب سمجھا گیا خاص کر کے فن بیان علما نے اس امر کی
تعلیم کے لئے لکھا ہے کہ ایک معنی خاص کو متعدد طریقوں سے ادا کرنے
کی صورتیں کیا کیا ہیں۔

مثلاً تشبیہ استعارہ مجاز کنایہ پھر ان میں سے ہر ایک کے اقسام
گوناگوں ہیں

یعنی ایک معنی خاص کے ادا کرنے کے فن بیان میں سیکڑوں طریقے
ہیں جب اس فن کی تعلیم کا رواج عالمگیر ہو رہا تھا اوسی زمانے میں
غزل ایجاد ہوئی ہے یعنی جو پڑھیں اس کی مشق بھی کریں۔

سعدی کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک غزل کے مضامین
ایک ہی طرح کے چلے آتے ہیں اور بار بار کہے جاتے ہیں۔

یہ سب مضامین عامۃ الورود ہیں اس لئے کہ فطرۃ انسانی سب میں
مشترک ہے ایک ہی طرح کے ولولے ایک ہی طرح کی امنگیں

ایک ہی قسم کے جذبے سب میں پائے جاتے ہیں مضمون کہاں سے الگ الگ آئیں گے۔ طرز بیان کا الگ الگ ہونا البتہ ضرور ہے کلام میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ایک تو اصل مضمون دوسرا طرز بیان۔ ان دونوں میں اصل مضمون کسی کا مال نہیں اس لئے کہ وہ ہر شخص کا مال ہے ہاں طرز بیان اپنا اپنا الگ ہونا چاہیئے ورنہ سرقہ کا الزام عاید ہوگا۔

طرز بیان ہی وہ چیز ہے جس کے لئے علمائے اسلام نے فن بیان کو ایجاد کیا اور غزل گویوں نے اس مشق کو حد اعجاز تک پہنچا دیا۔

لکھنؤ کا ایک شاعر زنار بند جس کا سارا کلام زمانے نے شاید تلف کر دیا ایک عارفانہ مطلع غزل کا چھوڑ گیا ہے جو دلوں پر لکھا ہوا ہے اور کبھی نہیں مٹنے کا ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

میرے کرمفرما نواب عبدالرحمن خاں شاطر نے اس بیت سے کیا اچھا استنباط کیا ہے ؎

بے محل پڑتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلق لیل و نہار

اصل مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر کام مصلحۃ و حکمۃ پر مبنی ہوتا ہے

اس مضمون کے ادا کرنے کے دو پیرایے دونوں بیتوں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے۔ سرقہ کہنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس طرزِ ادا کو ترک کر دیا ہوتا

بلکہ بیدل کا یہ شعر ؎

چوں کاغذِ آتش زدہ مہمانِ بقاییم
طاؤس پر افشانِ چمن زار فناییم

غالب کے اس شعر سے بہت مشابہ ہے ؎

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمریِ پرواز
دام ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤسِ شکار

بیدل نے بے ثباتیِ عمر کے بیان میں کاغذ آتش زدہ کو طاؤس پر افشاں سے تشبیہ دی ہے غالب نے جوش بہار کے بیان میں اس کاغذ کو دام اور اس کے شعلہ کو طاؤس سے تشبیہ دی ہے دام و شکار کی نازک تفصیل نے مضمون ہی کو کچھ کا کچھ کر دیا اس زمانے کے مضمون نگاروں نے غالب کے کلام سے صدہا سرقے نکالے اور شائع کیے مگر وہ خود ہی نہیں سمجھے نہ سمجھیں گے۔

غور سے دیکھیے تو اسے بھی سرقہ نہیں کہہ سکتے۔

مجھے ناصر علی کے اس مصرع سے ؏

تپید در آئینہ جوہر چو ذرہ در روزن

غالب کا یہ مصرع یقینی اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ع

پر افشاں جوہر آئینہ میں جیسے ذرے روزن میں

لیکن ذرّوں کا روزن میں پر افشاں ہونا تڑپنے سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے

جلال اسیر کے اس شعر سے بھی ؎

جنوں بمستی و ہشیاری آزمود مرا

ز بسکہ محو تو بودم زمن ربود مرا

دیکھیے مرزا غالب نے کیا خوب استنباط کیا ہے جو قابل وجد کرنے کے ہے ؎

نیہ و تعدد و عالم کی حقیقت معلوم

لے لیا مجھسے مری ہمت عالی نے مجھے

ان دو مصرعوں میں کیا کیا مضامین عالی نکل آتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسیر نے بھی تمثیل کہا تھا غالب نے اس پر بھی ترقی کی خیر یہ لوگ تو بڑے مرتبے کے ہیں نواب سید محمد خاں رند جو حقیقت میں رند ہی تھے ان کو دیکھیے اور اس شعر کو دیکھیے ؎

میں مسافر ہوں اتر جاؤنگا پار اک دم میں

تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے اس طرح کہا تھا ؎

کرتی ہے بوے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

اسی امید میں کہ شاید کوئی ایسا شعر نکل آئے عمر بھر فکر غزل نہیں چھٹتی اور تمام اصناف شعر چھوٹ جاتے ہیں۔

کبھی غزل گو دو مصرعوں میں ایسا مضمون باندھ جاتا ہے کہ وہ مسلسل نظموں میں اس برجستگی کے ساتھ نہیں بندھ سکتا نظیری کا یہ شعر لوگوں کے دلوں پر لکھا اور زبانوں پر جاری ہے۔

بوی یار من ازیں ست وفامی آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

مرزا رفیع سودا نے اس سے یہ مضمون استنباط کیا اور اساتذہ کا کلام دیکھنے سے یہی استنباط کو مقصود ہوا کرتا ہے ؎

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیناکہ چلا میں

کوئی یہ نہ خیال کرے کہ میں سودا پر سرقہ کا الزام دھرتا ہوں ہرگز سرقہ نہیں یہ مضمون ہر ایک انسان کی فطرت میں داخل ہے جس زمانہ میں انگریزی کا مجھے شوق تھا اور گرے کی نظموں کا ترجمہ کر رہا تھا یہی مضمون ٹینسن کے یہاں میں نے اس لباس میں دیکھا کہ "شگوفوں نے بے خودی میں اپنے عطر دانوں کا عطر لنڈھا دیا"

یہ بات وہم میں بھی نہیں آتی کہ نظیری کا یہ مضمون ٹینسن تک پہنچا تھا

اسی مضمون کو مونس نے اس طرح باندھا ہے کہ مسدس کے ایک
بند میں کربلا کی سرزمین کا ذکر کیا ہے جہاں بہار آئی ہوئی ہے۔ ع

بلبلیں پھول لئے پھرتی ہیں منقاروں میں

یہ مصرع پڑھ کر مجھے مرحوم کا یہ کہنا بھی یاد ہے کہ سب صاحب اس
مصرع کو یاد رکھیں۔ اس کے بعد دوسرے بند میں بنی فاطمہ کے نونہال
کا ذکر چار مصرعوں میں کیا ہے بیت یہ ہے ؎

انکی نکہت جو گذر جاتی ہے گلزاروں سے
بلبلیں پھول گرا دیتی ہیں منقاروں سے

آپ نے دیکھا کس قدر پھیلا کر اس مضمون کو مونس نے کہا کہ انہیں
کہنا پڑا کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔
بادشاہ کے سبعہ سیارہ میں مرزا علی بہار مرحوم نے اسی مضمون کو س
میں کیا خوب کہا ہے ؎

باغ میں بلبلیں کی بیتیں جو مزا دیتی ہیں
ڈالیاں جھوم کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں

جس مضمون کے لئے مونس مرحوم کو مسدس کے کئی بند کہنا پڑے
نظیری و سودا و بہار نے دو ہی مصرعوں میں نظم کیا ہے۔
طولانی مضمون کو مختصر کرنے کی مشق غزل گو کو ہو جاتی ہے او

یسا ہونا بھی چاہیئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفاعیلن چار بار

ترے جلوہ کے آگے اپنی ہستی کو فنا پایا
یہ پیغام اجل ہم نے دمِ قالوا بلیٰ پایا
کیا پائے طلب کو قطع تو دستِ دعا پایا
خدائی بھر سے ہم نے ہاتھ کھینچا تو خدا پایا
رگِ گردن سے اقرب آسمان کے ماورا پایا
نہ پہچانا کبھی ہم نے اوسے اور بارہا پایا
نفس کو شہر خاموشاں کا ہم نے رہگرا پایا
رہِ بے نقش پا و کاروان بے درا پایا
تعلق ایک نعمت کو ہزاروں نعمتوں سے ہے
تری درگاہ سے جتنا ملا اس سے سوا پایا

تعلق ایک حسرت کو ہزاروں حسرتوں سے ہے
دل بے آرزو پایا تو سمجھو مدعا پایا

خدا گر ہمت عالی بھی دے اور خاکساری بھی
سمجھنا چاہیے بس حاصل ارض و سما پایا

نہ اب پست و بلند دہر کو مڑ کر بھی دیکھوں گا
بہت گر پڑ کے میں نے جادہ صبر و رضا پایا

گدائی کا ملا تھا ٹھیکرا جو در سے ساقی کے
اسی کو بزم جم میں ساغر گیتی نما پایا

خوشی کیا سال نو کی غافلو اس دار فانی میں
یہ سوچو تو بھلا اک سال کھویا تم نے یا پایا

بھروسا زیست پر کچھ ہے نہ ایام جوانی پر
شرار سنگ اسے دیکھا اسے رنگ حنا پایا

جسے ہو دید کی حسرت سنبھلنا اس کا مشکل ہے
کلیم اللہ نے بھی مثل نرگس کے عصا پایا

چلی ہے سیل کچھ آزردہ چیں بر جبیں ہو کر
گدا کے گھر میں کیوں آئی تھی جو اک بوریا پایا

نہ سمجھے آبلہ پائی کو میری قافلے والے

نمک افشاں کوئی پایا کبھی تو شور و را۔۔۔ پایا
زمینِ شعر پر اے نظم ہم بھی شب کو گزرے تھے
اٹھا لائے ہیں دامن میں اسے جو کچھ پڑا پایا

(۹) (۲)

کلامِ حق ہے توریت اب مجھے یہ اعتبار آیا
خبر موسیٰ نے جسکی دی تھی وہ ناقہ سوار آیا
وہ اس وادی کے گرم و سرد و خشک و تر کو کیا جانے
جو مثلِ باد گزرا اور مانندِ شرار آیا
مدارِ آسماں کو تنگ سمجھا میری ہمت نے
میں اک فتراک کے حلقہ میں عمر اپنی گزار آیا
تعالی اللہ اک دانہ میں یہ تفصیل مضمر تھی
کھلے گل کونپلیں پھوٹیں شگوفے نکلے بار آیا
یہاں جلوت ہے یا ہیں اور یہ خلوت و بلد کی تم ہو
ہزار آنکھوں سے میں اس بزم میں مثلِ شرار آیا
جہاں میں چند دن مہماں ہے ہر فرد و فنا لیکن
وہ مہماں کیا ہے جن کو جو لباسِ مستعار آیا
زنِ دنیا نے گو غازہ کشی کی دل لبھانے کو

مگر اب بھی تو عارض پر نہ رنگ اعتبار آیا
محبت لالہ و گل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پر طاوس پر آخر وہی نقش و نگار... آیا
گناہوں سے نہیں مہلت در توبہ پہ جانے کی
پکارا کرتی ہے رحمت کوئی اُمید وار آیا

(۱۵) ۳

جہاں کو مژدہ اس جان جہاں کی آمد آمد کا
قیامت مصرع ثانی ہے جس کے مصرع قد کا
ہوئے افلاک پیدا نام جب آیا محمدؐ کا
طلسم عالم امکاں تھا یارب قفل ابجد کا
مواعظ کے گہر عالم میں بکھرانے کو نور اسکا
ابھر آیا ہے غوطہ مار کر دریائے سرمد کا
زباں سے گو نہیں کہتے ہیں تھا انتظار اسکا
گواہی دے رہا ہے دل ہر اک مبیں و موبد کا
کسی میں ہے کہ عالم کا تسلی دینے والا ہے
کسی انجیل میں لکھا ہوا ہے نام احمدؐ کا

(دو انگلیاں اٹھا کر رسول اللہؐ نے فرمایا تھا انا والساعۃ کہا تاین ۱۲
(لغت میں موبد اور موبّد دونوں طرح آیا ہے ۱۲)

تری رفتار میں بیشک ہے اعجاز مسیحائی
ہما بن کر فلک پر اڑ گیا سایہ ترے قد کا

براق تیز تگ جب طارم افلاک سے گزرا
تو مثل گرد رنگ اڑنے لگا چرخ زبرجد کا

تجھے معراج کی رفعت ہے فرش خاک پر حاصل
سر عرش اعلیٰ تکا ہے تیری مسند کا

تجھی سے عالم اسرار علم کن فکاں ہے تو
سبق روح القدس مکتب میں جب پڑھتے تھے ابجد کا

دعا مقبول ہو جاتی ہے تیرا نام لینے سے
ملا بندوں کو موقع حق تعالیٰ کی خوشامد کا

ملا اللہ اکبر کیا صلہ تیرے نواسوں کو
کہ ان کا قصر ہے یاقوت کا ان کا زمرد کا

مسیر فرش تا عرش اک قدم مرکب کا ہے تیرے
مقام قاب قوسین ایک گوشہ تیری مسند کا

تعالی اللہ ہے اس شاہ کی شان کریمی
بھرم کھلنے نہیں پاتا منافق کی خوشامد کا

له رسول اللہ منافقوں میں گھرے ہوئے تھے اور سب سے مدارا کرتے تھے ۱۲

(۱۳)

نہ چھوڑے گا ورِ حیدر کو اب نظمِ ثنا گستر
یہی وردِ رسول اللہ کے شہرِ علمِ بے حد کا
کہاں ہے کعب سیکھے ہم سے آئینِ ثنا خوانی
کہ نعتِ مصطفےٰ اور ذکرِ شمشیرِ مہند کا

(۱۴)

نظر آتا ہے ابر آسا گذرنا کوہساروں کا
کہ عالم عالمِ اجسام ہیں ہے بے قراروں کا
کیا ہے دستگیری کا جو وعدہ اسکی رحمت نے
کلیجا ہاتھ بھر کا ہو گیا امیدواروں کا
گلستاں ہو کہ خارستاں ہو سوتوں چاہے عبرت تیں
یہ مقتل نیزہ بازوں کا وہ مقتل تاجداروں کا
نہیں ہے شرک سجدہ کی جہت مشرق ہو یا مغرب
سمجھتا ہے اگر تو اک مرجع سب اشاروں کا
کرم اوفی ید اعلیٰ سے زیادہ ہے تعالی اللہ
نگلوں سے بیشتر نشو و نما ہوتا ہے خاروں کا

لہ فتح مکہ کے روز کعب نے جو قصیدہ آنحضرت کے سامنے پڑھا تھا اس میں رسول اللہ کی نسبت سیف من سیوف الہند کا لفظ تھا حضرت نے اصلاح دی کہ سیف من سیوف اللہ ۔

نہ شوخی اے صبا کر وضع میں اب فرق آتا ہی
غبار راہ نچا نہ ہو جائے کہیں ہم خاکساروں کا

ضلالت میں گھرے ہیں اور علائق مانع عزل
شب تاریک ہے اور کاٹنا ہی کوہساروں کا

بہت جلدی کی تونے کوس رحلت کے بجانے میں
کہیں تے ای اجل ماتم نہ دیکھا دوستداروں کا

شرار و برق کی فرصت سی کم ہی فرصت ہستی
کہ سیکھا ہے سمند عمر نے بھرنا تراروں کا

ہوا میں ان کے ذری ہوں تو ہوں جمع ناموں گزرے
پتہ روئی زمیں پر تو نہیں ملتا مزاروں کا

بہانہ ڈھونڈھتی ہی اس کی رحمت تو یہ کیا جانے
گنہ ہے گردن مینا پہ واعظ بادہ خواروں کا

کہوں میں کیوں اسے عقد گہر پہنے ہوئے دیکھا
نظر آیا مجھے خورشید پر جھرمٹ ستاروں کا

کھلا رہتی ہے کیا سرمہ نگاہ سرمگیں تیری
کہ اف کرتا نہیں مارا ہوا تیرے اشاروں کا

منجم بھی ہے کیا اے نظم ہم فرقت نصیبوں میں

یہ اس کا جاگنا راتوں کا یہ گننا ستاروں کا

(۱۹) (۵)

جفا و جور کی حد ہو گئی سمجھیں گے ہم اچھا
ستائے جاؤ تم اچھا کئے جاؤ ستم اچھا
اجل بھی دیکھ کر آفت میں کر جاتی ہے رم اچھا
بھلا کیت تک چھپائنگی یہ منہ دیکھیں گے ہم اچھا
مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہی۔ اٹھنا دم بدم اچھا
دل مضطر کو میرے چھوڑ کر مشق جفا کیسی
یہ کافر تیر کے قابل ہی یا صید حرم اچھا
چھپایا اس نے منزل کو بتایا راستہ اس نے
غبار رہ برا ٹھہرا رہا نقش قدم اچھا
رہے گبر و مسلماں منزل مقصد سے بیگانہ
ملا اس راہ میں ہنگامۂ دیر و حرم اچھا
بگڑنا پھر تیرا مہرباں ہونا ہے ایک آفت
یہ انداز کرم اچھا ہے یہ طرز ستم اچھا
نہ دیکھ انداز آئینہ میں اپنا پوچھ لے مجھ سے

زمانہ بھر سے اچھا اور تیرے سر کی قسم اچھا
جواب صاف دیکر توڑتے کیوں ہو مری دل کو
مجھے لیت ولعل اچھی مجھے لاو نعم اچھا
مقام شکر ہے جو کچھ دیا جتنا دیا اس نے
مقدر میں نہیں ہرگز خیال بیش و کم اچھا
نہ کھوئی اپنی عزت کاسہ لیس اغنیا ہو کر
کبھی جام سفالیں سے نہ سمجھے جام جم اچھا
نفس دزدیدہ جانا خوابگاہوں میں حسینوں کی
نکالا سیر کا وقت اے نسیم صبح دم اچھا
کوئی پوچھے ذرا وارفتگان حسن سے اُس کے
وفا ہے یا جفا اچھی کرم ہے یا ستم اچھا
ورماندوں کو سمجھائے کوئی لِلّٰہ پوچھے تو
ملال آپس کا اچھا اِلکے یا رہنا بہم اچھا
سناتا ہے ہر اک اپنی قدح کی خیر عالم میں
سمجھتے ہیں کہ سب سے آپ اچھے اپنا دم اچھا
اگر ایسا ہی پر آشوب ہے ہنگامہ ہستی
تو پھر شہر خموشاں خوب ہے ملک عدم اچھا

(۵)

لحاظ اتنا ابھی تک حضرت ناصح کا باقی ہے
وہ جو کچھ حکم فرماتے ہیں کہہ دیتے ہیں ہم اچھا
نہ پایا شعر ہم نے دفتروں میں اور سب کچھ ہے
زباں اچھی مضامیں خوب ہاتھ اچھا قلم اچھا
روانی کو کلام نظم کی انصاف سے دیکھیں
تو کھل جائے کہ ہے تلوار اچھی یا قلم اچھا

(۶)

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن.. کا
گلستاں میں بھی کیا تم آتش افروزی کو آئے تھے
لگا ہے ہوا میں اُڑ کر رنگ گلشن کا
جو نازاں مردم آزاری پہ ہو اسکو یہ وہ ثمرہ
اجارہ چونٹیوں کو مل گیا گور تہمتن... کا
جنازہ جس گھڑی پہنچا لب مرقد تو ہم سمجھے
ذرا بھی فاصلہ دیکھا نہ گہوارہ سے مدفن کا
نہیں ہے کار فرما رنج و راحت کا سوا اسکے
مری آنکھوں پہ سر پر شکر و شکوہ دوست دشمن کا

مسیحا و خضر کیا جانیں لذت کو شہادت کی
نہ دیکھی جنھوں کی نادری نہ چشمہ آب آہن کا

نہ پوچھو دل فلک کے حادثہ سے کس طرح ٹوٹا
یہ شیشہ تھا نشانہ ہو گیا سنگ فلاخن کا

یہ کیا باعث کہ لب تک جان آ آ کر پلٹ جائے
اجل بھی کچھ اشارہ پا گئی اس چشم پرفن کا

خبر اس کی نہ تھی یہ بھی خلاف طبع گزرے گا
گلا کاٹا تھا ہم نے دیکھ کر انداز چتون کا

لئے جاتے ہیں کیا کیا حسرتیں ہمراہ کوئے قاتل سے
جنازہ اٹھتے اٹھتے ہو گیا ہے سینکڑوں من کا

وہ دیکھو صف کی صف بسمل ہوئی جس کی نگاہ نے
کوئی میری طرف منہ پھیرے اس ناوک افگن کا

گریباں میرا تیرا دیکھنا اک ہاتھ میں ہو گا
کہے دیتا ہوں میں ناصح مزاج اپنا ہے الجھن کا

کیا تو قید لیکن یاد رکھنا چارہ گر یہ بھی
کہ توڑا ہو گا چوڑی کی طرح سے طوق آہن کا

سنیں [illegible]

ہوا یہ سلسلہ اپنی احادیثِ معنعن.. کا
وطن کا حال پوچھ اے نظم توسیل حوادث سے
ملے بجلی تو پوچھوں میں نشان اپنی نشیمن کا

(۱۴) (۷)

تجمّل دیکھ کر تیرے شہیدانِ محبت کا
مسیحا و خضر پڑھنے لگے کلمہ شہادت کا
مرے دل سے اگر نکلا شرارہ سوزِ فرقت کا
خدا معلوم ہو کیا حشر خورشیدِ قیامت کا
مسیحا سے مداوا کیا ہو تیرے سوزِ فرقت کا
رہا مہرِ درخشاں کو بخار اور کیسی شدّت کا
فرشتہ تو نہیں ہے پاکدامن ہو تو کیونکر ہو
کہ دل رکھتا ہے انساں اور دل بھی ایک آفت کا
نہ پوچھو دورِ گردوں میں حلاوت زندگانی کی
کہ اپنا خون پیتے ہیں مزا لے لے کے شربت کا
سلایا اس نے جب چاہا جگایا اس نے جب چاہا
ہمارے اور اس کے بیچ میں پردہ تھا غفلت کا
ذرا سن تو سہی کیا شور ہے شہرِ خموشاں میں

جو عاقل ہیں یہاں آکر سبق لیتے ہیں عبرت کا
شباب اس طرح سے گزرا کہ اب معلوم ہوتا ہے
وہ باتیں اک زمانہ کی ہیں قصہ ایک مدت کا
فغان آبشار و اشک ابر و گریۂ شبنم
جدھر دیکھو ادھر رونا ہے اپنی اپنی قسمت کا
جو چھپ چھپ کر نہ روؤں راز پنہاں رہ نہیں سکتا
کہ میرے آنسوؤں میں رنگ ہے میری طبیعت کا
نہیں ہرگز مجال دم زدن آئینہ خانہ میں
ہے اس محفل میں ہنگامہ دو صد آئینہ حیرت کا
دل آزاری کی عالم میں ہوا چلتی ہے ای حیدر
بگولے رقص کرتے ہیں مٹا کر نقش تربت کا

(۸)

سوا جلوہ کے تیرے اور میرے دل میں کیا ہوتا
سمجھتا اس کو بت خانہ جو نقش ماسوا ہوتا
تجھے کیا سمجھ کر ناز یکتائی اٹھاتا ہوں
وگرنہ میں بتا دیتا جو کوئی دوسرا ہوتا
کسی کا ذکر کرکے اس قدر لی چٹکیاں میرے

گل خود رو چمن میں ہنستے ہنستے رو دیا ہوتا

بچھایا جس نے زانو مسندِ الفقر فخری پر
نہ کیوں نقشِ سلیماں اس کا نقشِ بوریا ہوتا

نہیں اٹھ سکتا مجھ سے خنجرِ مژگاں کا صدمہ بھی
کہ تو نے آنکھ پھیری ہی میں نظروں سے گرگیا ہوتا

وہ برہم ہو گئے زلفیں ذرا رخ سے جو سرکائیں
خطا گر اور کچھ ہوتی نہیں معلوم کیا ہوتا

مرے باعث سے عالم میں ہوا مشہور تو ورنہ
یہ شہرے ہر جگہ ہوتے یہ چرچا جا بجا ہوتا

تھکا ہارا تلاشِ منزلِ مقصد کا ہوں حیدرؔ
قدم پر اس کے سر رکھتا جو کوئی رہنما ہوتا

(۹) (۱۷)

مٹا دی اس نے ہستی آستینوں کو اگر الٹا
عدم کا اٹھ گیا پردہ جو دامن کا کمر الٹا

نگاہِ نازآئینہ میں رکھتی ہے اثر الٹا
ادھر دیکھو قیامت ہو گئی یہ جادو اگر الٹا

بہار آئی اٹھے بادل چلے صحرا کو دیوانے

ہوئی الجھن بڑا آزار دل الٹا جگر الٹا
نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوتیں وہ عیش کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر الٹا
موذن نے اذاں مغرب کی دی صبح شب فرقت
بجائیں توتی نے وردیاں الٹی گجر.. الٹا
وہ بل کھا کر اٹھے ہیں قتل کرنے کو پڑا تا ہوں
مجھی پر کچھ نہ کچھ الزام دہر دیگی کمر الٹا
صبا کی شوخیوں پر رشک کیا مجھکو آتا ہے
کہ آنچل اس کا یوں سوتے میں بخوف و خطر الٹا
جواب آیا نہ مرغان چمن سے میرے نالوں کا
گلے کو کس قدر پھیرا زبان کو کس قدر الٹا
وہ آئینہ جو میری آنکھ سے دیکھیں تو بتلا دوں
کلیجہ تھام لیں پلٹ کرے تیر نظر الٹا
کسی نے آکے آنسو بھی نہ پونچھے ہجر کی شب میں
نسیم صبح نے منہ سے مرے دامان تر الٹا
گلی میں اس ستمگر کی نہ جائے لاش بھی میری
بہا دینا مجھے اے سیل اشک چشم تر الٹا

زباں منہ میں حریف کینہ جو کے ہر کہ بچھو ہے
نہ اک سیدھی سی بات اس کی نہ اس کا نیشتر الٹا

بہار باغ دونی ہو گئی ہے مینہ برسنے سے
نظر آنے لگا ہر ایک تھالے میں شجر الٹا

لب دریا تماشا انقلاب دہر کا دیکھو
کہ پانی دوپہر بہتا ہے سیدھا دوپہر الٹا

براق اس طرح روز و شب کی حد سی ہو گیا باہر
نظر آنے لگا مہر مبیں سیدھا قمر الٹا

چلے ہیں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سی مری نکلے
پریشاں باندھ کر گیسو دوپٹا اوڑھ کر الٹا

جو ہو سچ بات وہ اے نظم دو پہلو نہیں رکھتی
نظر آتا ہی یکساں رکھیئے سیدھا یا کہ ہر الٹا

(۹) (۱۰)

صواب اپنی خطا کو اپنے عیبوں کو ہنر جانا
نہ ہے گم کردہ منزل رہزنوں کو راہ بر جانا

ہمیشہ ہمت عالی کو اپنا راہبر جانا
اسی رستے چلا جس راستہ کو پر خطر جانا

گلا گھونٹا ہے میرا تو نے کیوں او خوفِ رسوائی
شکستِ رنگ کے نغمہ کو بھی کیا شورِ شر جانا

یہ میری سادگی اے عمرِ رفتہ میری نادانی
کہ تجھ کو ہمرکاب و ہم عناں و ہم سفر جانا

لیا ہے میں نے ملکِ خاکساری کو تواضع سے
اسی انداز سے جھکنے کو شمشیرِ کمر جانا

شعاعِ ورنگ کو سرگم میں سمجھا سازِ ہستی کی
تماشائے جہاں کو نغمۂ تارِ نظر جانا

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دئے دیتی ہیں پروانے
انہوں نے شمع کے شعلہ کو شاید تاجِ زر جانا

ذراسی آبرو جو قطرۂ شبنم سے بھی کم تھی
سنا جو ہر شناسوں نے اسے آبِ گہر جانا

مصائب بھی جہاں کی بے ثباتی ایسے نظر آئے
کریں نے آفتابِ حشر کو شمعِ سحر جانا

مجھے وارفتگی پر تشنۂ عرفاں کا تھا دھوکا
جسے تجھ سے بے خبر دیکھا اوسی کو باخبر جانا

ؔلہ سرگم کے سات سُر جیسا طرح ساز سے نکلتے ہیں اسی طرح شعاع کے سات رنگ تارِ نظر پر چڑھتے اترتے ہیں

نہ کام آئی ہماری عقل تو کیا تیرے جلوہ کو
باندازِ دگر دیکھا بہ عنوانِ دگر جانا

بنایا رنج و راحت کو جو توام میرے خالق نے
انہیں دو نعمتوں کو میں نے بھی شیر و شکر جانا

خزانہ سے کہیں بڑھ کر ہے استغنا طبیعت کا
کہ پایا کم سے کم تو بیشتر سے بیشتر جانا

ضرر پہنچا نہ مجھ کو آن کر اس بھرکے چھتی میں
کہ میں نے نوش کو بھی نیش بلکہ نیشتر جانا

دکھائے چاند رخساروں پہ چھلوں نے جو گھونگر کے
منجم نے اسی کو فتنۂ دورِ قمر جانا

فنا کی منزلوں میں ساتھ کافور و کفن بھی تھا
اسے رختِ سفر سمجھا اسے گردِ سفر جانا

جہاں میں اس طرح سے اپنی زیرِ آسماں گزری
کہ اس کو رہگذر۔ اس کو غبارِ رہگذر جانا

روانی عمر کی دیکھی کبھی گردش ستاروں کی
تبسم برق کا اس کو اسے رقصِ شرر جانا

مثل ہے نظمؔ جو سویا وہ کھویا حسبِ حال اپنے

(۱۱) شب قدر آج ہی تھی ہم نے یہ وقت سحر جانا (۱۱)

ادا ہیں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں
ستم کیسا کیا شرما کے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
نہ اگلی سی محبت ہے نہ اگلی سی مروت ہے
الٰہی خیر وہ انداز ہی اب تو بدل ڈالا
تمھاری بزم میں آ کر نہ کچھ کہتے بنی ہم کو
گلا نالے نے گھونٹا شکایت نے مسل ڈالا
فلک کو دیکھ کر شکوہ کریں ہم یہ ارادہ تھا
کہا جھک کر فلک نے سر اٹھایا اور کچل ڈالا
جدا ہے پاؤں سے زنجیر تیشہ دور ہے سر سے
رفیقان کہن میں تفرقہ خوب اے اجل ڈالا
نہ یہ دیکھا فلک نے کون سرکش کون ہے عاجز
گیہوں کے ساتھ اس نے آسیا میں گھن بھی دل ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ لگے کرنے

تعلی بڑھ گئی موباف جو پہلے پہل ڈالا
موذن کی خوش آہنگی بے ہنگام تو دیکھو
شب عشرت میں ان حضرت نے ناحق کو خلل ڈالا
بنایا غیر کو اس نے نشانہ اپنے پیکاں کا
کسی نے چاہنے والے کا دل جنگلی سی مل ڈالا
علائق میں پھنسا کیوں جلوہ گاہ قدس سے آکر
بتا اے نظم آخر بھیس کیوں تو نے بدل ڈالا

(۲۰) (۱۴)

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

وہ دیکھو روند کر مدفن کسی کا
چھلاوا بن گیا توسن کسی کا
نہ کرنا منہ شکار افگن کسی کا
نہ رکھنا تسمہ گردن کسی کا
وہ آنا پھیر کر چتون کسی کا
وہ سر پر گوشۂ دامن کسی کا
نگہ ہنگامہ برہم زن کسی کی
تبسم صاعقہ افگن کسی کا
چھری پھیریں گے یہ ابرو کسی کے
کرے گی خون یہ چتون کسی کا
اٹھے اس رہ میں صدہا گرد بنکر
نہ پہونچا ہاتھ تا دامن کسی کا
ستاروں کا بچھونا کہکشاں ہے
گیا ہے لوٹتا دامن کسی کا
کسی کے قصر پر کیوں کیجیے رشک
سر لحد ہے یہ نہیں مسکن کسی کا

دیا دو گز کفن گردوں نے وہ بھی | ڈھکا جس سے نہ وو دن تن کسی کا

کوئی ہے کینہ جو اپنے لئے ہے | تجھے کیا تو نہ ہو دشمن کسی کا

نہ پوچھو فاتحہ پڑھنے کا انداز | وہ نازک ہاتھ تھا اور مدفن کسی کا

غبار کاروان بیخودی ہوں | نہ رہبر ہوں نہ میں رہزن کسی کا

چڑھوں میں عرش پر کیوں ہاتھ چھٹکے | پتا قرب رگ گردن کسی کا

گنہ کوئی کری بزم میں ٹھہروں | کبھی سے دل نہ ہو بدظن کسی کا

درازی زلف کی ہے روز افزوں | لہو پیتی ہے یہ ناگن کسی کا

مجھے چاک قبائے گل نے مارا | یونہیں نکلا تھا پیراہن کسی کا

دکھایا میں نے آئینہ تو بولے | ستم ہے آج تو جوبن کسی کا

زوال حسن پر ہے کچھ باقی | ڈھلا سا کچھ ہی ہے جوبن کسی کا

زہے رحمت پسند آئی جو اس کو | سر سجدہ خم گردن کسی کا

زخود رفتہ ہی تجلی آج اے نظم
اسے کیا مل گیا خرمن کسی کا

(۱۴۳) (۱۴۳)

فعولن فعولن فعولن فعول

بڑے معرکے سی ہے آیا ہوا | لہو میں ہے آنسو نہایا ہوا

گہر ہے کہ صبح بناگوش میں | ستارہ سا ہے جھلملایا ہوا

وہ عنقا نظروں سے اوجھل بھی ہے
پھر آنکھوں میں بھی ہے سمایا ہوا

نہ لی خبر تو مجھ سے تو لے نہیں
کہیں ہوں فلک کا ستایا ہوا

سزا وار رحمت ہوں میرا کریم
کہ آیا ہوں تیرا بلایا... ہوا

غضب کی تھی میدان محشر میں دھوپ
گنہوں کی ظلمت سے سایا ہوا

نظر جب سے آئی ہے زلفِ سیاہ
اندھیرا ہے آنکھوں میں چھایا ہوا

جنوں میرے جن کی طرح ہے سوار
اجل کی طرح دل پہ آیا ہوا

خوشی میں نے تیری بہر حال کی
خفا مجھ سے اپنا پرایا ہوا

رہائی خودی سے نہ ممکن ہوئی
یہ پہرا ہے کس کا بٹھایا ہوا

چمکتا ہے ایسا وہ کندن سا رنگ
کہ سونا ہو جیسے گلایا ہوا

چھڑکتے ہیں وہ ان پہ ایسے گلاب
کہ جاتا ہے ہوش آیا ہوا

میری نظم کا ہے دلوں پر اثر
یہ سکہ ہے اپنا بٹھایا ہوا

(۱۴) (19)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ایک سے ایک اس قدر افگن کا احساں بڑھ گیا
تیر سے دل بڑھ گیا پھر دل سے پیکاں بڑھ گیا
لے کے مشتاقوں کو شوقِ بزمِ جاناں بڑھ گیا

مضطرب سی مضطرب حیراں سے حیراں بڑھ گیا

بڑھتے بڑھتے کس قدر طومار عصیاں بڑھ گیا
چند دفتر قصۂ خواب پریشاں بڑھ گیا

سر ندامت سے جھکانے کا بھی موقع اب نہیں
گھٹتوں گھٹنوں تھا جو پانی تا گریباں بڑھ گیا

بحرِ تلاطم میں تھی خود بھی کشتیِ عمر رواں
دل کے پیچھے پیہم وھڑکنے سی بھی طوفاں بڑھ گیا

روز کی بیداد اے چرخ اور اک عالم کی آہ
دیکھنا اک دن چراغِ مہرِ تاباں بڑھ گیا

سامنے دونوں کے تھا میداں ہوائے وصل کا
رہ گئی پیچھے تمنا دورِ ہجراں بڑھ گیا

دیدہ خورشید صبح و شام ہو جاتا ہے سُرخ
کس قدر اس عہد میں آشوبِ دوراں بڑھ گیا

آرزو یہ تھی کہ آ جائے گلے میں تیرے ٹھیک
ایک ہی شب میں مہِ نو کا گریباں بڑھ گیا

یہ تو چمکی بار بار آنکھیں اسے ڈھونڈا کریں
برق سے بھی غمزۂ عمر گریزاں بڑھ گیا

نعمتِ خلت کا جب سے ذوق میرے دل کو ہے
خوانِ ابراہیم پر اک اور مہماں بڑھ گیا
تیرا شیوہ دل فریبی کا بہت مشہور تھا
جاں ستانی کا بھی اب تو ساز و ساماں بڑھ گیا
اہلِ کشتی کو مسرت ہے چلی بادِ مراد
نامرادی کہہ رہی ہے اور طوفاں بڑھ گیا
ہو گا خود ساماں پیدا چاہیے کچھ دل میں جوش
شورشِ فریاد سے برچھوں نیستاں بڑھ گیا
سچ یہ ہے جس روز بسم اللہ مکتب میں ہوئی
دودھ تیرا اس دن اے طفلِ دبستاں بڑھ گیا
تھا یہ کس کی قبر کا سبزہ کہ جس کو دیکھ کر
پاؤں پھیلانے میں دامن سے گریباں بڑھ گیا
عہدِ پیری میں ہوا روشن بیانی کو فروغ
صبح ہوتے جلوۂ شمعِ فروزاں بڑھ گیا
ابنِ مریم ایک ہی ٹھوکر لگا کر رہ گئے
سو قدم ان سے مرا عیسیٰ دوراں بڑھ گیا
یا فروائے نظم مصرع ناسخِ مغفور کا

(۱۵) سو چمن آگے مرا سروِ خراماں بڑھ گیا (۱۱)

ساقیا خالی نہ جائے ابر یہ آیا ہوا
ہو رہے ہیں سرخ شیشے دل ہے للچایا ہوا
داغِ دل چمکا جو اس کے طالب دیدار کا
جھلملاتا ہے چراغ طور شرمایا ہوا
عاشقوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا محشر میں بھی
دھوپ میں پھرنے سے ہے کچھ رنگ سونلایا ہوا
دل بھی ٹوٹا بلبلِ ناشاد کا پھولوں کے ساتھ
دامنِ گلچیں میں اک غنچہ ہے کمھلایا ہوا
کشمکش میں آرزوئے قتل نکلے کس طرح
مضطرب میں بھی ہوں قاتل بھی ہے گھبرایا ہوا
آج پھر ناصح وہی چلتا ہوا فقرہ کہا
بارہا کا جو کہ ہے ارشاد فرمایا ہوا
دیکھئے تسکیں اس نے اعجاز مسیحائی کیا
رہ گیا قالب میں دم ہونٹوں تلک آیا ہوا
بام پر وہ جلوہ فرما ہے مقابل کون ہو

چاند کچھ دب دب کے نکلا بھی تو شرمایا ہوا
سرو و سنبل دیکھتے ہی خاک میں مل جائیں گے
بال یہ بکھرے ہوئے چلنا یہ اٹھلایا... ہوا
ابر تو آیا بھی ساقی اور برس کر کھل گیا
میری آنکھوں میں اندھیرا رہ گیا چھایا ہوا
کل تلک منہ ڈھانک کر سوتی میں دم گھٹتا تھا نظم
آج داماں کفن منہ پر ہے ڈھرایا ہوا

(۲۱) (۱۶)

بسکہ سیلاب بر فنا دار صحن ثابت ہوا
بلبلہ پانی کا یہ چرخ کہن ثابت ہوا
نقش باطل جب خیال ما و من ثابت ہوا
دہر میں انسان آوارہ وطن ثابت ہوا
کہتی ہیں تیری نگاہیں تجھ پہ خون بے گناہ
او قدر انداز ناوک فگن ثابت ہوا
جب ہوا چلتی ہے نرگس کی جھپک جاتی ہے آنکھ
برق خاطف شعلہ رنگ چمن ثابت ہوا
منہ چھپا لینے کا ساماں ہو گیا محشر میں بھی

یوں اڑی رنگت کہ دامانِ کفن ثابت ہوا

رات کو یہ وہم تھا سے عارضِ روشن پہ نیل

صبح کو وہ نقش برگِ یاسمن ثابت ہوا

سمجھے تھے دلدار و دلسوز و دلآرام اس کو حیف

دلفریب و دلربا و دل شکن ثابت ہوا

دل میں تیرے تو لگا کر تیغ ٹھنڈک پڑ گئی

کچھ گنہ میرا نہ اے شمشیر زن ثابت ہوا

اب کے ہی فصلِ جنوں میں ناتوانی اس قدر

پیرہن اپنا نہ اپنا پیرہن ثابت ہوا

ہم تو جینے ہی کو سمجھے تھے کہ مشکل ہے بہت

جان دینا بھی نہایت ہی کٹھن ثابت ہوا

دوش پہ بکھرے جو گیسو یہ پھڑک کر رہ گیا

دل اسیرِ دامِ زلفِ پُر شکن ثابت ہوا

سرخ اس کافر کی پیشانی پہ قشقہ کھینچ کر

خون گردن پر تری اے برہمن ثابت ہوا

جی گیا آنے سے اس کے مر گیا جانے سے میں

مجھ پہ اس میں ارتباطِ جان و تن ثابت ہوا

اس جہاں میں لوگ کہتے ہیں کہ تن ثابت نہیں
میں یہ کہتا ہوں کب اُس عالم میں تن ثابت ہوا
سختیاں جھیلے نہ کیوں انسان دنیا کے لئے
کوہ کن پہ کب فریب پیر زن ثابت ہوا
شوق میں اس جا وہ گرکے مہر عالمتاب بھی
مثل اک ذرہ کے آوارہ وطن ثابت ہوا
زلف و قد کا تھا جو سودا خون ہو ہو کر بہا
دل ہمارا کشتہ دار و رسن ثابت ہوا
جھک پڑی چہرے پہ لہرا کر جو زلف پرشکن
شاخ سنبل کا ثمر سیب ذقن ثابت ہوا
قہر ڈھایا جب اٹھا مظلوم کے دل سے دھواں
ایک مورِ ناتواں بھی پیل تن ثابت ہوا
سر پہ تیشہ طرہ خسرو کا دیتا ہے جواب
آج اے فرہاد تیرا بانکپن ثابت ہوا
وقت بد میں ہر طرف سی شکلیں ہوتی ہیں نظم
آئینوں میں جابجا سورج گہن ثابت ہوا

(۱۷)

ولہ

آپ کی محفل میں آکر دل مکدر لے چلا
آئینہ لایا تھا میں سدِ سکندر لے چلا
دیدۂ تر لے چلا اشکوں کی چادر لے چلا
میں جدھر اٹھا بسانِ موج بستر لے چلا
دل صفِ مژگاں کی جانب سہی مکدر لے چلا
میں بھی ہر مہ کی طرح سے گردِ لشکر لے چلا
سامری نے سحر کو پھر زندہ کرنے کے لئے
آکے مٹی تیرے قدموں کی فسونگر لے چلا
روزِ محشر میری از خود رفتگی دیکھو ذرا
خود اسی کے سامنے شکووں کا دفتر لے چلا
نیند میں تجھ کو بھی آخر کچھ خبر ہے یا نہیں
آہ مو آنکھوں سے تری کاجل چرا کر لے چلا
آکے میخانہ میں ہم مستوں کو پہلے لوٹ لے
کس طرف او ابرِ دریا بار لشکر لے چلا
دیکھنا صبح شبِ عیش اس کے گیسو کی شمیم
مٹھیاں بھر بھر کے باسی ہار عنبر لے چلا
زلف برہم ہو گئے او لجھی چٹکیاں مشکل نے لیں

بوسہ مجھ سے چھین کر بندے کا گوہر لے چلا

میں سرائے دہر میں ٹھہرا تھا مثل ابر و برق

کروٹیں دو چار ابھی باقی تھیں کہ بستر لے چلا

میری پلکوں سے روانی اشک خوں کی دیکھ کر

ابر تر آ کر رگ سودا پہ نشتر لے چلا

ہم رہے محروم حسن و عشق کے دربار سے

طوق قمری لے چلی طرہ صنوبر لے چلا

بھا گئی ہم کو یہ تیری سیر چشمی اے حباب

آن کر دریا میں بھی خالی ہی ساغر لے چلا

میں تو سمجھا تھا عدم سابق بھی ہے لاحق بھی ہے

ہائے پھر ہستی کی تہمت کیوں لگا کر لے چلا

میں ہمہ تن آہ و نالہ خواب مرقد سے اٹھا

استخواں ہر ایک اپنا صور محشر لے چلا

کاروان گل چلا آخر ہوئی فصل بہار

سبزہ خود رو چمن سے اپنا بستر لے چلا

وقت آخر آشکارا ہو گئے سب دل کے داغ

خود میں اپنی قبر پہ پھولوں کی چادر لے چلا

بوشگوفوں سے نکل آئی گریباں پھاڑ کر
باغ کو جوشِ جنوں جامہ سے باہر لے چلا
عفو کا خلعت گناہوں کی ندامت پر ملا
نذر دینے اشک جو لایا تھا گوہر لے چلا

(۱۸) ولہ (۲۱)

آج محشر میں بھی ہوں تشنہ تری بیداد کا
ہیں گلا گھونٹوں خیال آئے اگر فریاد کا
دل کو ٹکرے تو سہی ظالم ملا کر مجھ سے آنکھ
منہ ذرا دیکھوں تو میں ترکِ ستم ایجاد کا
لاش پر میری اگر آجائے وہ وعدہ خلاف
اتنا کہدینا کہ کیا کہنا تمہاری یاد... کا
جانتے ہو پوچھنے سے حالِ دل ہوتا ہے رنج
نام کیوں لیتے ہو پھر اُس خانماں برباد کا
تھا منا مجھ کو یہی ہے کوئے قاتل کی زمین
ہر قدم پر سامنا ہونے لگا افتاد کا
ظلم سہہ کر بنایا خود اسے سفاک خلق
داورِ محشر سے منہ پڑتا نہیں فریاد کا

نہر پر لہرا رہا ہوں میں بطے کے لئے
ڈھل گیا دن وہ تک سایہ گیا شمشاد کا

وہ جوانی کے مزے وہ جھگڑے وہ وصل و ہجر
شعبدہ یہ بھی تھا ایک اس چرخ بے بنیاد کا

عشق کا عالم نظر آتا ہے عالم ہی نیا
ہے زمیں افتاد کی اور آسماں بیداد کا

کون سنتا ہے میری فریاد اس کو دیکھ کر
پڑ گیا غل اہل محشر میں مبارک باد کا

اب نہ گلشن ہے نہ اپنے آشیانہ کا پتہ
کچھ بگولہ اٹھ گئے دنیا ہے نشاں صیاد کا

میں ابھی محو سراپا تھا کہ رات آخر ہوئی
وصل کی شب میں تھا عالم سایۂ شمشاد کا

چہرہ اترا ہی چلا جاتا ہے اس کا شرم سے
کام کرتی ہے نزاکت مانی و بہزاد کا

تیر جستہ ہوں میں غربت ہے سدا اپنا وطن
جس جگہ جا لگی بستر ہوا آزاد کا

رہ گیا اپنا سا منہ لیکن ہیں شوق قتل میں

خنجرِ قاتل مجھے آئینہ تھا فولاد کا
ہائے کیا سہما ہوا تھا نالۂ مرغِ چمن
رہ گیا بن کر چراغ ایک خانۂ صیاد کا
لشکرِ بادِ بہاری اور جنوں کی کشمکش
گل کا نکلا پیرہن شانہ چھلا شمشاد کا
شیخ کو جھک ہے کہ سمجھائے مجھے شکلِ عروس
ذہن میں لاؤں کہاں سے باقرِ داماد کا
دیدۂ فتاں نے مارا ہے کوئی پرساں نہیں
اس ستم اس قہر اس اندھیر اس بیداد کا
اے فلک اس گردشِ بیجا سے کیا حاصل ہوا
شاد کرنا بھی تجھے آیا کسی ناشاد کا
پاس میرے تم کو تو آتا نہیں یک دم قرار
ہے تعجب دل میں رہ جانا تمہاری یاد کا
نظمؔ نے آخر گوارا کر لیا داغِ فراق
دل پہ رکھا ہاتھ دامن چھوڑ کر جلاد کا

ہرزہ گردی سے قدم ... پیدا ہوا

داغ سے دل درد سے اپنا جگر پیدا ہوا

وہ کھلیں کلیاں وہ جھکے پھول دے جلدی شراب

وہ ہوا آئی وہ ساقی ابر تر پیدا ہوا

عشق کا تیرا اسی دن سے ہے میرے دل میں داغ

پرتو خورشید سے جس دن قمر پیدا ہوا

خون اسی دن سے جگر میرا ہے دل بیتاب ہے

جب حنا میں رنگ پتھر میں شرر پیدا ہوا

ہر گھڑی لپٹائے رہتا ہوں کلیجہ سے اسے

دوسرا معشوق یہ داغ جگر پیدا ہوا

دل کو بھی آخر مرے عادت الجھنے کی ہوئی

گیسوئے پیچاں کی صحبت کا اثر پیدا ہوا

میں نہ کہتا تھا کہ گلشن میں نہیں جائیں حضور

نالۂ بلبل سے آخر دردسر پیدا ہوا

ہاتھ پھیلانے میں شکل برگ کچھ حاصل نہیں

دیکھ غنچہ کی طرف مٹھی میں زر پیدا ہوا

آتش افروزی یہ کی کس طالب دیدار نے

طور جل کر رہ گیا ایسا شرر پیدا ہوا

مرتبہ رکھتی ہے اسے زاہد سیہ کاری مری
ابر رحمت سے مراد امانِ تر پیدا ہوا

میری آنکھوں میں جہاں سارا تجلی زار تھا
نخل ایمن اس کو سمجھا جو شجر پیدا ہوا

آپ سے باہر ہوئے جس دم تو پایا دوست کو
اپنا گھر چھوڑا تو اس کے دل میں گھر پیدا ہوا

میری مٹی میں نہاں ہیں مثلِ اخگر سوز شیں
خاک جب سرکی ذرا داغ جگر پیدا ہوا

طور خاکستر ہوا ہے قوم موسیٰ کے لئے
ناحقیقت بیں جو تھے کحل البصر پیدا ہوا

ہو چکی طے راہ ہستی جھک گیا اب قدِ راست
شکر ہے ملکِ عدم کا نظم در پیدا ہوا

۱۹ — ولہ — ۲۰

ہم فقیروں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہو جائے گا
جام ہمدم شیشۂ مے ہمنشیں ہو جائے گا

آکے میخانہ میں جو عزلت گزیں ہو جائے گا
دورِ گردوں اس کو دور ساتگیں ہو جائے گا

راستی گر چاہتا ہے کر تواضع اختیار
سیدھا اک سجدہ زمیں لے نقش نگیں ہو جائے گا
دل کو روشن کر اگر ہے نیش زن زنبور غم
چاندنی راتوں میں پیدا انگبیں ہو جائے گا
بارِ عصیاں روز لے جایا کریں گے گر ملک
دبتے دبتے آسماں آخر زمیں ہو جائے گا
لے چلی تختِ رواں سے خاک مدفن میں فضا
دیدۂ مور اب سلیماں کا نگیں ہو جائے گا
پہلے اپنی بات کا پیدا تو کرے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہدیگا یقیں ہو جائے گا
کچھ تو رہنے دے قیامت کیلئے بھی اے فلک
کیا عذابِ حشر سب مجھ پر یہیں ہو جائے گا
خود نمائی اس قدر منبر پہ واعظ خیر ہے
ناز یہ کرنے سے کیا تو نازنیں ہو جائے گا
خامۂ ذہنِ رسا کا روز افزوں ہے کمال
وہ تو صورت گر یہ معنی آفریں ہو جائے گا
تو ستارہ کو مرے اے پستیِ طالع نہ کھینچ

آسماں کا آسماں زیرِ زمیں ہو جائے گا

آنکھ میں اک رس ہے لیکن شرط ہے طرزِ نگاہ
زہر ہو جائے گا یا یہ انگبیں ہو جائے گا

کچھ دنوں نوکِ مژہ کاوش اگر کرتی رہی
نام تیرا نقشِ دل میرا نگیں ہو جائے گا

بزم میں بے تیرے پہنچا ئیگا ساغر چشمِ زخم
خطِ پیمانہ نگاہِ نکتہ چیں ہو جائے گا

بحث رندوں سے نہ کر جا جا کے واعظ اسقدر
کیا رہے گی پھر اگر ملزم کہیں ہو جائے گا

تجھ سے اٹھیگا بھلا پھولوں کے اس گہنے کا بوجھ
قدِ موزوں رشکِ شاخِ یاسمیں ہو جائے گا

پھر ذرا تم مڑ کے دیکھو تو سہی زندہ ۔ ابھی
کشتۂ تیرِ نگاہِ شرمگیں ہو جائے گا

زلف گرہو کر پریشاں کروٹوں میں آ گئی
کھا کے بل ہوئے کمر بھی عنبریں ہو جائے گا

دردِ دل کا نظم کو رہتا ہے رونا روز روز
جان سے بیزار اگ دن ہمنشیں ہو جائے گا

۲۱

دل نے پھر وارفتۂ حُسنِ بت پُرفن کیا
اشک خوں نے پھر چراغِ آرزو روشن کیا

چھوٹ کر تیر اس کی چٹکی سے یہ دیتا ہے صدا
آفریں کیا کام تو نے اے اشکار افگن کیا

بوسہ لینے کا تھا کلیوں کے چٹکنے پر جو وہم
شرم سے پھر منہ نہ اس نے جانبِ گلشن کیا

گھل کے کاجل نے کیا آنکھوں کو نیلوفر کا پھول
جھم کے مستی نے لبوں کو غیرتِ سوسن کیا

شمع میں تو آج کی شب روشنی مطلق نہ تھی
تو نے آ کر خانۂ تاریک کو روشن کیا

بعد مرنے کے بھی میں ایسا ہوں دشمن کام خلق
شمع نے گریہ نہ اک دن بھی سرِ مدفن کیا

ہے نگاہِ یار شوقِ روزنِ دیوارِ یار
مثلِ دیوار اس نے دل میں بھی مرے روزن کیا

کون سنتا ہے فغانِ درویش کی ہم نے تو نظم
آہ کی فریاد کی نالہ کیا شیون کیا

۲۲ — ۱۱

اس نے دکھلا کے جھلک اپنی جو دیوانہ کیا
طور پر جا کے ادا سجدۂ شکرانہ کیا

تو نے حیرت زدۂ حسن کو دیوانہ کیا
آئینہ کو ترے جلوہ نے پریخانہ کیا

منزل دہر نہیں چھاؤنی چھانے کا مقام
وہی عارف ہے گذر جس نے فقیرانہ کیا

خاک میں مل کے یہاں نشو و نما ہوتا ہے
سبز موتی کا نہ بارش نے کوئی دانہ کیا

سارے عالم کو بنایا ہدف تیر اجل
قدر انداز نے یہ شغل حکیمانہ کیا

آج گردوں نے کیا شہرۂ آفاق جسے
کل اُسے محفل احباب کا افسانہ کیا

کم نہیں دل سی تڑپنے میں سویدا دل کا
اسے اسپند بنایا اسے پروانہ کیا

پھیرنا آنکھ کا عشوہ نے سکھایا مجھ کو
اس میں پیدا اثر گردش پیمانہ کیا

اس سے تو سلسلۂ زلف میں آوارہ نہیں
گوش زد یار کے کس نے میرا افسانہ کیا

سادگی آ گئی جب ڈھل ہی گیا عہد شباب
پھر کبھی آئینہ دیکھا نہ کبھی شانہ کیا

الحذر ظلم بہت جھک کے فلک ملتا ہے
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

۲۳ — ۱۶

کھینچئے آئیگا سینہ سے جو پیکاں اپنا
پھر بچانا تجھے مشکل ہے گریباں اپنا

اٹھ گئی کشتیٔ مے بزم سے ہنگام سحر
دن چڑھا تخت اڑا لے گئیں پریاں اپنا

اڑ کے جاتی ہے مری خاک اُدھر گلہ ادھر
کچھ پتا دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا

حشر کے دن بھی ہیں ہر ایک کا منہ تکتا ہوں
کوئی اب بھی نظر آتا نہیں پرساں اپنا

ہوں وہ شوریدہ کہ ہو جوں کی طرح پیچ در پیچ
چاک ہوتا ہے گریباں پہ گریباں اپنا

کہیں پیا تو ہو روز سیہ پیش آئے
نہ کہیں رنگ جمالے شب ہجراں اپنا

کی جو اخگر کی طرح گردِ کدورت پیدا
مل گیا خاک میں آخر دلِ سوزاں اپنا

بس کہ تحصیل ادب بے ادبوں سے ہے مجھے
ہے خرابات زمانہ میں دبستاں اپنا

دل یہ کہتا ہے کہ پھر فصل جنوں آئی ہے
خود بخود چاک ہوا ہے جو گریباں اپنا

پنے ہی پاؤں میں چبھتی ہیں جو بوئے کانٹے
اپنے ہی سر پہ ہوا کرتا ہے احساں اپنا

جوشِ وحشت میں بھی پابند قناعت ہیں
اپنے دامن کو سمجھتا ہوں بیاباں اپنا

اس نے سو مرتبہ شب بھر میں سنوارے گیسو
آئینہ اس کا رہا دیدۂ حیراں اپنا

روزِ محشر کی بھی ایذائیں اٹھالوں گا مگر
منہ دکھانا نہ مجھے اے شبِ ہجراں اپنا

سر بہ زانو ہوئے جب آپ میں رہتے نہیں ہم
جادۂ دشت ہے ہر بخیۂ داماں اپنا

لی خبر حضرتِ ناصح نے بڑی دیر کے بعد
چڑھ چکا تربتِ مجنوں پہ گریباں اپنا

وہ زمانہ بھی زمانہ تھا عجب اے حبیب
آشیاں اپنا تھا گل اپنے گلستاں اپنا

۲۳ — ۱۴

ہے ستم مرغ چمن شور مچانا تیرا
زخم دل پر ہے نمک ریز ترانہ تیرا

بھی روتا ہے جو بھولے سے کبھی آنا تیرا
یاد آتا ہے شبِ غم میں رلانا تیرا

س کا شکوہ کروں کس کا گلہ کروں مشکل ہے
آسماں تیرا زمیں تیری زمانہ تیرا

ے فلک خوب ہوں آگاہ روش سے تیری
جانتا ہوں کہ رلائے گا ہنسانا تیرا

حوصلے رہ گئے ای فصل جوانی افسوس
ولولے دل کے سوا کم ہے زمانہ تیرا

غمزدہ درد رسیدہ ہوں میں ای شمع مزار
دل دکھاتا ہے مرا اشک بہانا تیرا

یوں نگہ پھیر لے وہ آنکھ ملا کر مجھ سے
ای اجل خوب سمجھتا ہوں بہانا تیرا

حال کھل جائیگا آنے دے بہار ای بلبل
پر اثر ہیں مرے نالے کہ ترانہ تیرا

بیمروت کوئی پھر تجھ سے ملے کس دل سے
آج تک یاد ہے وہ دل کا دکھانا تیرا

ای جنوں سچ ہی گلا کاٹ کے مر جانا تھا
خوب رسوا ہوئے کہنا جو نہ مانا تیرا

حسرت تیر انہیں بھی ہے جو ہیں بے پر و بال
جب سے دیکھا ہے نشانہ کو اڑانا تیرا

تیر لگتا ہے کلیجہ پہ کبھی دل پہ کبھی
ٹھیک پڑتا ہی نشانہ پہ نشانہ تیرا

مسکرائے جو شگوفے تو بہت رویا میں
ہونٹ تیرے مجھے یاد آئے ہنسانا تیرا

تا کجا شرح غم و درد خدارا حیدر
ہچکیاں لگ گئیں سن سن کے فسانہ تیرا

۲۵ —————— ۱۳

مژدہ اے بادہ کشو ابر بہار آ پہنچا
کوہ سے جھوم کے اٹھا لب دریا پہنچا

ہاتھ ملتے رہے سب اسکی دل آزاری پر
نہ گریباں تلک ہاتھ کسی کا پہنچا

چاند کو دیکھ کے طالع شب تنہائی میں
میری آنکھوں میں منہ تا بہ دریا پہنچا

بلکہ جواب سے لکھا بھی تو لکھا صاف جواب
بعد مدت کے یہ تقدیر کا لکھا پہنچا

دوستو بہر خدا چھوڑ کے مرقد میں مجھے
اس طرح بھی کوئی بھولا کو غذا مشتہر آ پہنچا

خاک مرقد میں وہی جذب کہ تم سن لینا / گرتا پڑتا اسی منزل پہ مسیحا پہنچا

گوشہ گبری کو وہ اللہ نے شہرت دی ہے / کہ نہ اس کے پر پرواز کو عنقا پہنچا

چاہتا ہی نہ رہے خواب گران غفلت / دل پر ایک زخم لگا زخم کو ایذا پہنچا

اس کے درباں نے کہا دیکھ کے زنداں مجھے / دیکھ لینا کہ چھٹا اور یہ سیدھا پہنچا

جلوہ شاہد معنی ہے حریم دل میں / آنکھ جب بند کی مانند نظر جا پہنچا

شانہ گیسو میں جو الجھا تو وہ مجھ ہی سے الجھے / پڑ گئے زلف میں بل ہاتھ کو جھٹکا پہنچا

شب غم میں ملک الموت کا آنا دیکھو / شکر ہے شکر اس آفت میں یہ جیتا پہنچا

مسند فقر کا اپنی ہے وہ رتبہ اے نظم
نہ تو قیصر اسے پہنچا نہ تو کسریٰ پہنچا

۲۶ ——— ۱۱

دل کا طالب وہ ہوا جان کا خواہاں نہ ہوا / وہ ہوا درد کہ جس کا کوئی درماں نہ ہوا

قائل مہر و وفا دشمن ایماں نہ ہوا / ہائے کافر کو نہ ہونا تھا مسلماں نہ ہوا

کب بہر زلف سیہ سلسلہ جنباں نہ ہوا / حیف وہ دل کہ حریف خم چوگاں نہ ہوا

ہم کو حاصل یہ ہوا پھونک کے خرمن اپنا / برق کہتی ہے کہ تنکے کا بھی احساں نہ ہوا

ہو گیا سانحہ اپنا بھی عجب عبرت خیز / مفت میں جان بھی دی یار پشیماں نہ ہوا

دل کا سب راز ہی عنوان جبیں سے ظاہر / لاکھ لاکھ اس کو چھپایا کبھی پنہاں نہ ہوا

حلقہ دل زدگاں میں تھا گذر ناصح کا / آج اس بزم میں وہ فتنہ دوراں نہ ہوا

ڈھا دیا دستِ اجل نے تو قضا نے لوٹا
کاغذِ باد ہوا تختِ سلیماں نہ ہوا

ساری عالم کا تو معشوق تھا اے حسنِ شباب
کس کا گیسو ترے ماتم میں پریشاں نہ ہوا

نہ مزاج آپ نے پوچھا تو گلہ مجھ کو نہیں
شکر کرتا ہوں کہ شرمندۂ احساں نہ ہوا

فکرِ پاداش نہ کچھ شرمِ گناہ حیف اے نظمؔ
سر بہ زانو نہ ہوا سر بہ گریباں نہ ہوا

۲۷ ۱۴

مختصر مرحلۂ طولِ امل کیا ہوگا
قطع یہ سلسلۂ بے تیغِ اجل کیا ہوگا

آج کچھ ہو نہیں سکتا ہے تو کل کیا ہوگا
سر پہ جب آن ہی پہنچے گی اجل کیا ہوگا

دور کر تیرگیٔ دل کہ ابھی تک ہے وقت
ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا

حرکتِ چرخ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے
ورنہ بے صوتِ حدی رقصِ جمل کیا ہوگا

چاہیے گوشۂ دل وادیٔ ایمن ہو نہ طور
جلوہ زار اس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا

ہاتھ میں چوم لوں زاہد ترے پہلے یہ بتا
میری بخشش کا سبب تیرا عمل کیا ہوگا

دیکھ کر زخمِ جگر کو مرے کہتا ہے رقیب
جس کا یہ پھول ہے اس تیغ کا پھل کیا ہوگا

قطعہ

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ
تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

جب میں کہتا ہوں چلو ترکِ محبت ہی سہی
اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ چل کیا ہوگا

حسنِ نیت تو ہی زاہد کا ۔۔۔ تو معلوم
دیکھتا ہے اثرِ حسنِ عمل کیا ہوگا

بیٹھے ہیں گوشہ عزلت میں ہم اب توڑکے پاؤں
ہاتھ منت کش ارباب دول کیا ہوگا

تلخ کامی کی حلاوت کو نہ پوچھو ہم سے
اس سے بڑھ کر مزہ قند و عسل کیا ہوگا

بڑھتی جاتی ہے ہوس عمر ہے جوں جوں بڑھتی
اس کا انجام اب اے طول امل کیا ہوگا

نظم اک آفی وفانی ہے پھر اس سے ناراض
خالق لم یزل و عزوجل کیا ہوگا

۲۸ ———— ۱۵

سرو کی طرح اگر بر زدہ داماں ہوتا
مثل غنچہ کے نہ میں سر بگریباں ہوتا

رشک فغفور نہ ہم رتبۂ خاقاں ہوتا
آدمی کچھ بھی نہ ہوتا اگر انساں ہوتا

کاشکے پیش نظر مجمع خوباں ہوتا
اور ان میں سے کوئی جان کا خواہاں ہوتا

مار ڈالا ہے زمانہ کی دورنگی نے مجھے
لاش پر بھی کوئی گریاں کوئی خنداں ہوتا

ہم کہاں بیٹھ کے رستے میں سے تڑپ سکیں
نقش پا کوئی تو اے عمر گریزاں ہوتا

چھپ گئے گرد میں سب قافلے والے افسوس
اس طرح بھی ہے نظر سے کوئی پنہاں ہوتا

مرغ بسمل ہوں نہیں میری تڑپ کا علاج
چاہتا ہوں کہ وہی سر وہی ساماں ہوتا

حلقے تدویر کواکب کے مسلسل رہتے
کوئی ان کا نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

تھاہ اس عالم اجسام کی لیتا تو کوئی
قطرہ میں بحر تو ذرہ میں بیاباں ہوتا

اعتبارات پہ ہستی کی بنا ہے قائم
ہم نہ ہوتے تو کہاں عالم امکاں ہوتا

دور تھا سوز غم ہجراں کا مجھے اے واعظ
میں بھلا خوف سے دوزخ کے مسلماں ہوتا

دیکھ لیتا جو کسی کے یہ ستارہ کا عروج
کہکشاں ہی فلکِ انگشت بدنداں ہوتا

تجکو ثابت قدم اے شمع سمجھتے جب ہم
سوزِ غم کی کوئی حد ہوتی نہ پایاں ہوتا

زاہدِ خشک بتا پھر تری کیا گت بنتی
کوئی میخوار اگر دست و گریباں ہوتا

دل کا ارمان نکلتا تو ہے مشکل اے نظم
دم نکلنا ہی کسی طرح سے آساں ہوتا

۲۹ — ۱۵

آنکھ پھرنے میں جو رنجش کا نہ پہلو ہوتا
مجھ کو آہوں سے زیادہ رمِ آہو ہوتا

حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
نکل سکے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا

دم نکلتا بھی تو ہم ضبط ہی کرتے غمِ عشق
نیل ڈھلتا بھی تو آنکھوں میں نہ آنسو ہوتا

ہم سمجھتے کہ کیا سیماب کو کشتہ ہم نے
اگر اپنے دلِ بیتاب پہ قابو ہوتا

پیچ گیسو نگرنے جو ڈالے ہیں اگر کھل جائے
کچھ کمر سے بھی نکلتا ہوا گیسو ہوتا

اثرِ کاہ ربا دل کو ہوا ہے حاصل
پھینک دیتے بھی وہ ناوک تو ترازو ہوتا

جیسا سودائیوں کا ہے مرے رونے پہ ہجوم
ایسا میلا بھی کبھی نہ لبِ جو ہوتا

دل کا بوجھ نکلتا جو کسی نالے میں
برجِ میزاں کیلئے سنگِ ترازو ہوتا

میرے نالے جو شبِ تار کو سمٹا لاتے
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا

پرخطر تھی شبِ ہجراں کی سیاہی ایسی
دن نکلتا بھی تو سہما ہوا جگنو ہوتا

لٹے گلزار میں صیاد کو نیند آجاتی
شاخِ نرگس پہ جگایا ہوا جادو ہوتا

ضبط گریہ بہت آسان تھا گر مشکل تھا
دل میں ناسور تو ناسور میں آنسو ہوتا

ہم دکھا دیتے رہیوں دے کے نکلتا ہی چاند
بام پر سر کو جو نیوہڑائے ہوئے تو ہوتا

سرمہ بھی دیدۂ فتاں میں لگاتا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبار رم آہو ہوتا

ہم سے بڑھ کر کوئی مجبور نہ ہوگا اے نظم
جان دینے پہ بھی اپنا نہیں قابو ہوتا

۱۸ —— ۳۰

جلوہ گر آنکھ میں بھی دل میں بھی پنہاں دیکھا
دیکھا دیکھا تجھے او فتنۂ دوراں دیکھا

دل کے آئینہ میں ہم نے رخ جاناں دیکھا
طور پر آپ نے کیا موسیٰ عمراں دیکھا

زیست میں چار طرف مرگ کا طوفاں دیکھا
تند آندھی میں چراغ تہ داماں دیکھا

تجھ نے پایا نہ قدم طول امل کے ہاتھوں
کالے کوسوں پہ مسافر نے شبستاں دیکھا

رشک ہے مجھ کو تری جامہ دری پر اے موج
جس طرف ہاتھ بڑھا اپنا گریباں دیکھا

پاؤں سے ہو ریلنے کے جو اٹھی گرد ذرا
ہم نے اس میں بخدا تخت سلیماں دیکھا

دیکھا نشتر کوئی کاری تو زبان منت
دیکھا پتھر کوئی بھاری تو احساں دیکھا

عالم وجد میں کھینچا تھا ابھی دامن یار
آگیا ہوش تو اپنا ہی گریباں دیکھا

دل بھر آنے کو بہانہ ہے ذرا سا کافی
رو دیے بزم میں شیشہ کو جو گریاں دیکھا

ہم نہ کہتے تھے کہ یہ جلوہ گری خوب نہیں
معرکہ رات کا ہے شمع فروزاں دیکھا

جھوٹ ہی جھوٹ نہ جانے تھی کبھی اور یہ سنا
سچ تو یہ ہے کہ عجب خواب پریشاں دیکھا

قسمت دہر میں لکھی ہوئی ہے ویرانی
میں نے ہر خاک کے ذرہ میں بیاباں دیکھا

جانے والوں میں وہ دہر کو سمجھے لیکن
سب کے آگے تجھے اے عمر گریزاں دیکھا

تو کنارے پہ کھڑا ہو جو رہا چھوڑ کے راہ
تو نے اے سرو چمن کس کو خراماں دیکھا

عکس عارض سے کسی کے یہ ہوا جوش صفا
آپ آئینہ سے اٹھتے ہوئے طوفاں دیکھا

یہ نہیں جانتا کیا ہجر میں گذری مجھ پر
آنکھ کھولی تو طبیبوں کو ہراساں دیکھا

قہر تھا پائے نگارین کا وہ ٹھوکر لینا
فتنہ حشر کو بھی خون میں غلطاں دیکھا

کشتنی تھا کہ نہ تھا ظلم نہ معلوم مگر
قتل کے بعد ستمگر کو پشیماں دیکھا

۳۱ —— ۱۳

راہ الفت میں پس و پیش یہ کب دل آیا
مثل آواز جرس کے میں و منزل آیا

قیس نے دیکھ لیا جھانک کے لیلی کا جمال
بید مجنون جو نظر صورت محمل آیا

کف افسوس ہے اپنی ہی زمانے کو سرور
اس غم آباد میں میں مثل جلاجل آیا

نگہ شوق نے یہ پردہ دری کیسی کی
آخر اس شوخ کو غصہ سر محفل آیا

برق سی تیز کہیں ہے روش عمر رواں
جس نے اک سانس لی وہ سینکڑوں منزل آیا

مثل سبزہ کے نہ سرسبز ہوا نام مرا
مثل دانہ کے یہ جیب تنگ تہ گل آیا

اس سے پہلے کہ جگہ حرص بنائے دل میں
کب نظر موج ہوا کا کوئی ساحل آیا

کٹ گئی عمر زباں رک گئی چلتے چلتے
رشتہ شمع نظر جادہ منزل آیا

نیم جاں چھوڑ دیا مجھ کو تماشا دیکھو
رحم جلاد کو کیسا دم بسمل آیا

جان دیکر بھی نہ افسردہ ہوئی اہل کرم
ملک الموت کو سمجھے کوئی سائل آیا

نہ کسی جن کا گذر ہے نہ پری کا سایہ
تجھ پہ کوئی نہیں آیا ہے میرا دل آیا

خاکساری طلبوں کیلئے رفعت ہے عجب
دوش احباب پہ میں گور کی منزل آیا

سات پردوں کو جو آنکھونکے اٹھایا ای نظم
مجھ میں اور اس میں نہ پردہ کوئی حائل آیا

۳۲ — ۱۱

زندگی کیا ہے اک افسانہ کا دہرایا جانا
موت کہتی ہیں کسے زیست سے اکتا جانا

یاد ہے بزم مسرت میں ترا آجانا
جلوہ حسن سے وہ شمع کا شرما جانا

مغتنم قلزم ہستی میں رہا تار نفس
ڈوبتے کیلئے تنکے کا سہارا جانا

کبھی آنے نے نہ دیا خاطر نازک پہ ملال
مجھسے دیکھا نہ گیا پھول کا کمھلا جانا

دل ہی دل اُس کا تحمل ہے تحمل اس کا
کوہ کو جس نے پر کاہ سے ہلکا جانا

ہم کو عبرت نہیں اس بیخبری پر اپنی
کہ طلسمات دو عالم کو تماشا جانا

نہیں معلوم کہاں آئے کہاں جانا ہے
ایسا آنا ہی نہ اچھا تھا نہ ایسا جانا

آشیانہ کے سزاوار نہ تھا پیکر خاک
طائر روح نے اک شب کا بسیرا جانا

میں نے ہر ذرہ کی آغوش میں صحرا دیکھا
میں نے ہر قطرہ کو جولانگہ دریا جانا

جنبش باد بہاری نے نکالی ہے یہ چھیڑ
برق کو ابر کے آغوش میں تڑپا جانا

کس سے پوچھا تھا پتہ کس نے بتایا اے نظم
کس طرح آپ نے میخانہ کا رستہ جانا

۴۲ —————— ولہ —————— ۱۱

تنِ خاکی میں ہے افسردہ مرا دل ایسا
کوئی دانہ ہوا آگی نہ تہِ گل ایسا

کون ہے اپنے ہوا خواہوں کا قاتل ایسا
شکل تو چاند سی ہے آپکی اور دل ایسا

بھر گیا پھولوں سے دامانِ نظر جیب سماع
اسقدر کثرتِ گل شورِ عنادل ایسا

گور میں بھی نہیں طوفانِ حوادث سے مفر
موج تو ایسی بلا خیز ہے ساحل ایسا

میں سمجھتا ہوں کہ شادی کا سرانجام کیا
ل رہے ہیں کفِ افسوس جلاجل ایسا

عفو فرمائے جو ناصح تو میں اتنا پوچھوں
اس نے دیکھا ہے کوئی جور شمائل ایسا

بخش دے خلد کا گلزار وہ ایسا ہی کریم
اک پرِ کاہ کی پرسش کرے عادل ایسا

تیز رو جب تجھے اے ناقۂ لیلیٰ سمجھیں
دیکھ لے قیس اٹھے پردۂ محمل ایسا

تخم باقی نہ رہا کشت جو سرسبز ہوئی
سبزہ آتے ہی گیا رخ سے ترے تل ایسا

ہاتھ انگڑائیاں لے لیکے بڑھاتے ہیں جو زند
کشتی مئی کیلئے چاہئے ساحل ایسا

نظم نے ظلم سہے اور کبھی اُف منہ سے نہ کی
ہم نے دیکھا جگر ایسا نہ کہیں دل ایسا

۴۳ —————— فعلاتن فعلاتن فعلن —————— ۱۱

آگیا پھر رمضاں کیا ہوگا
ہائے اے پیرِ مغاں کیا ہوگا

باغ جنت میں مکاں کیا ہوگا
تو نہیں جب تو وہاں کیا ہوگا

خوش وہ ہوتا ہے مرے نالوں سے
اور اندازِ فغاں کیا ہوگا

دور کی راہ ہے ساماں ہیں بُرے
اتنی مہلت ہے کہاں کیا ہوگا

دیکھ لو رنگ پریدہ کو مرے
دل جلے گا تو دھواں کیا ہوگا

ہوگیا ایک نگہ میں جو تمام
وہ بہ حسرت نگراں کیا ہوگا

ہم نے مانا کہ ملا ملک جہاں
نہ رہے ہم تو جہاں کیا ہوگا

مر کے جب خاک میں ملنا ٹھہرا
پھر یہ تربت کا نشاں کیا ہوگا

جسطرح دل ہوا ٹکڑے از خود
چاک اس طرح کتاں کیا ہوگا

یا ترا ذکر ہے یا نام ترا
اور پھر وردِ زباں کیا ہوگا

عشق سے باز نہ آنا حیدر
راز ہونے دے عیاں کیا ہوگا

۳۵ ——— متفاعلن چار بار ——— ۱۴

یہ ہوا اثر حباب کا جو ہوا میں بھر کے ابھر گیا
کہ صدا ہے لطمۂ موج کی سر پر غرور کہ مر گیا

مجھے جذب دل لئے جو بھٹک کے رکھا قدم کوئی
مجھے پر لگا دئے شوق نے کہیں تھک کے میں جو ٹھہر گیا

مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اسقدر

کوئی جھونکا بادِ سحر کا تمھارے پاس سے جو گزر گیا

اثر اس کے عشوہ ناز کا جو ہوا وہ کس سے بیان کروں
مجھے تو اجل کی ہے آرزو اسے وہم ہے کہ یہ مر گیا

تجھے اے خطیبِ چمن نہیں خبر اپنے خطبۂ شوق میں
کہ کتابِ گل کا ورق ورق تری بیخودی سے بکھر گیا

کسے تو سناتا ہے ہمنشیں کہ ہے عشق دشمن عقل و دیں
ترے کہنے کا ہے مجھے یقیں میں ترے ڈرانے سے ڈر گیا

کروں ذکر کیا میں شباب کا سنے کون قصہ یہ خواب کا
یہ وہ رات تھی کہ گزر گئی یہ وہ نشہ تھا کہ اتر گیا

دلِ ناتواں کو تکان ہو مجھے اس کی تاب نہ تھی ذرا
غمِ انتظار سے بچ گیا تھا نوید وصل سے مر گیا

مرے صبر و تاب کے سامنے نہ ہجوم خوف و رجا رہا
وہ چمک کے برق بھی رہ گئی وہ گرج کے ابر گزر گیا

مجھے بحرِ غم سے عبور کی نہیں فکر اے مرے چارہ گر
نہیں کوئی چارہ کار اب مرے سر سے آب گزر گیا

مجھے رازِ عشق کے ضبط میں جو مزا ملا ہے نہ پوچھئے
مئے دو آتشہ کا یہ گھونٹ تھا کہ گلے سے میرے اتر گیا

نہیں اب جہاں میں دوستی کبھی راستہ میں جول گئے
نہیں مطلب ایک کو ایک سے یہ ادھر چلا وہ اودھر گیا
اگر آکے غصہ نہیں رہا تو لگی تھی آگ کہ بجھ گئی
جو حسد کا جوش فرو ہوا تو یہ زہر چڑھ کے اتر گیا
تجھے نظم وادی شوق میں عبث احتیاط ہے اسقدر
کہیں گرتے گرتے سنبھل گیا کہیں چلتے چلتے ٹھہر گیا

۱۳ فعلات فاعلاتن دوبار ۱۱

کہیں قابل سماعت مرا حال زار ہوتا
کہ فسانہ خوب تھا یہ اگر اختصار ہوتا
غم عشق تھا تو پھر کیوں غم روزگار ہوتا
نہ یہ جن کبھی اترتا نہ جنوں سوار ہوتا
نہیں خود کو دیکھ سکتا کہ جہاں میں خود ہے یکتا
کبھی اپنے عکس سے بھی وہ نہیں دوچار ہوتا
نہیں تاب ضبط غم کی مرے مشت استخواں میں
بھڑک اٹھتا خس میں پنہاں جو ذرا شرار ہوتا
در دوست کی طلب میں مجھے کیا برا تھا مرنا
جو قدم قدم پہ ہوتا جو ہزار بار ہوتا

مجھے اس خیال پر بس ہے امید عفو اس سے
کہ وہ چاہتا تو ہرگز نہیں بادہ خوار ہوتا

نہیں اعتنا کے لائق یہ وجود بے حقیقت
کہ اگر لباس ہوتا تو یہ مستعار ہوتا

میں سمجھتا مستحق ہوں میں سزا کا یا جزا کا
مری ہست و بود کا بھی تو کچھ اعتبار ہوتا

اگر اپنے سوز غم کو نہ دبا دبا کے رکھتا
تو چٹک کے اخگر اخگر ابھی اک شرار ہوتا

وہ مآل زندگانی جسے کہتے ہیں غم عشق
یہ اگر پہاڑ ہوتا تو نہ دل پہ بار ہوتا

دل نالہ کش میں قائل قدر افگنی کا تیری
کوئی تیر ایسا ہوتا کہ فلک کے پار ہوتا

۷۳ ——— مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات ——— ۹

جہاں میں کوئی نہ کوئی عدوئے جاں ہوگا
ہو اچمن میں نہ گلچیں تو باغباں ہوگا

جدھر سے قافلہ گزرے گا خاکسار ونکا
سپہر ناز شش گرد کارواں ہوگا

لگا کے تیر مجھے روئے گا لہو ظالم
کہ موج خوں اسے خمیازۂ کماں ہوگا

یہ آکے دیکھ کرامات میکدہ اے شیخ
کہ ایک جام میں تو پیر سے جواں ہوگا

گلا جو کاٹ کے مر جائے تو یہ ڈر ہے — کہ سب کا اس ستم ایجاد پر گماں ہوگا
نگاہ اس نے جو پھیری تو مر مٹا دل زار — خبر نہ تھی کہ یہ ایسا مزاج داں ہوگا
لگا کے تیغ بگڑیئے نہ لیجیئے انصاف — تڑپ سکے گا وہ کیوں کر جو ناتواں ہوگا
غضب کیا جو کسی کے خرام کو دیکھا — نہ جانتا تھا کہ دل یوں رواں دواں ہوگا

خدا کو ڈھونڈنے جانا ہے کیا کہیں اے نظم
ہر ایک جا وہ ملیگا جو بے نشاں ہوگا

۳۴ —————— ۱۶

کہا جو تو نے دل ناصبور میں نے کیا — بتا کہ تو نے کیا یا قصور میں نے کیا
بغل سے دل کو نکالا کچل کے پھینکدیا — یہ ایک مفت کا جھگڑا تھا دور میں نے کیا
یہ تم کہو کہ نہ آنا یہاں نہ آؤں میں — ضرور تم نے کہا اور ضرور میں نے کیا
تمہارا ذکر ہے کیا تم کو کون کہتا ہے — فساد میں نے اٹھائے فتور میں نے کیا
کہا تھا کس نے کہ موسیٰ سے تو لڑا آنکھیں — اشارہ تجھ سے تھا اے برق طور میں نے کیا
جہاں کہیں ہوئی کثرت رہا میں آپ سے دور — جہاں ملی مجھے خلوت ظہور میں نے کیا
رہوں میں ستر گریباں یہ امر تھا منظور — یہ سہل تھا کہ گریباں کو دور میں نے کیا
پھرا نہ سوچ حوادث نے لاکھ منہ پھیرا — چڑھاؤ کاٹ کے آخر عبور میں نے کیا
لگا نہ خاک سے دامن نہ خاک دامن سے — صبا کی طرح جہاں سے مرور میں نے کیا
اب اپنے پاؤں سے پیری میں سر نہیں اٹھتا — سزا یہ اس کی ہے جیسا غرور میں نے کیا

وہ حشر میں بھی ملیں مجھسے یہ نہیں امید / خفا ہیں اس لیے کیوں وصف جور میں نے کیا

یہ اڑ کے تخت سلیماں کی خاک کہتی ہے / بسر اب سر بال طیور میں نے کیا

وہ میرے نالہ سوزاں کو کیا سمجھتے ہیں / قیامت آئی اگر نفخ صور میں نے کیا

خدا نے منہ میں زباں دی زباں میں لطف سخن / اس ایک بات پہ کتنا غرور میں نے کیا

نگاہِ شوق نے میری سکھا دی آرائش / مژہ کو شانہ کش زلف حور میں نے کیا

جو مجھ سے ریختے میں اے نظم حسن ظن احباب

تو میں سمجھتا ہوں کچھ کمر و زور میں نے کیا

۳۹ —— ۱۶

ہزار آنکھ پڑی جب فراز بام آیا / ہمائے حسن پریزاد زیر دام آیا

یہ کیوں کہا تھا کہ میرا مہ تمام آیا / گیا سحر سے وہ ظالم تو وقت شام آیا

ہمارے حصے میں جھوٹا جو اسکا جام آیا / لب نگار سے بوسے کا یہ پیام آیا

ہے سب کو خانہ خرابی یہ شبہ تعمیر / ہوا غبار جو اونچا تو بن کے بام آیا

جو بھول کر بھی خوشی کا گزر ہوا دل میں / خیال موت کا لینے کو انتقام آیا

دیار عشق میں وہ صاحب نگیں ہوں میں / کہ یار کے لب لعلیں پہ میرا نام آیا

ترانہ سنج ہوا اے عندلیب تیرے لیے / ہر ایک گل مئے گلگوں کا لیکے جام آیا

کلیجہ پک گیا ناحق کو منہ لگانے سے / یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کیا خیال خام آیا

عذاب جاں مجھے ہو جاتی شام تنہائی / بھلے کو ساتھ بلاؤں کا اژدحام آیا

بڑا یہ حق محبت ادا کیا اس نے
کوئی جو ساتھ جنازے کے چند گام آیا

زبان کا دانتوں نے پیری میں ساتھ چھوڑ دیا
کوئی رفیق برے وقت میں نہ کام آیا

گیا ہے لینے کو اسکے مگر یقیں ہے مجھے
پیام بر کے لئے موت کا پیام آیا

گماں رقیب کا نامہ پہ ہے بجا مجھ کو
کلیجہ تھام لیا جب کسی کا نام آیا

کھلے جو بند قبا شب کو اسکے میں سمجھا
کہ صبح حشر ہوئی وقت انتقام آیا

نگاہ ہو کے پریشاں بکھری ہے کاکل سے
عجیب ہے کہ یہ رشتہ تھا بن کے دام آیا

خدا کا خوف کرو ظلم ہوش میں آؤ
کرو شراب سے توبہ مہِ صیام آیا

۴۰ — ۱۶

بشہوت و غضب آلودہ دل ما را
بہ کعبہ طرح بنا ریختی کلیسا را

ز خویش رفتہ گرفتیم راہ صحرا را
سلام ما کہ رساند دیار سلمیٰ را

اگرچہ رخصت دیدار دادہ ما را
نگاہ قہر تو خوں می کند تماشا را

ہوائے ابر بیغم و جوش صہبا را
شکست توبہ صد اکرد جام و مینا را

بہ بزم جلوہ بر فتیم و ہمچو آئینہ
فروختیم بہ یک عشوہ دین و دنیا را

گزشت عمر و ندیدم کہ آسماں بکشود
بہ ناخن مہ تو عقدۂ ثریا را

قلیل فرصت عمر و کثیر حاصل عمر
حباب چشم کشود و بدید دریا را

غبار بام ربودست و گرد باد ستوں
عجب کہ خانہ برانداختند صحرا را

عبور بحر معانی و دستیاری کلک
شگافتم بہ عصا چوں کلیم دریا را

حذر ز آہ فلک تا ز تو دلِ بیمار
کہ شکل دار بیاد آورد مسیحا را

ہزار معنی مثبت ز نفی می خیزد
کہ نیستی پر پرواز داد عنقا را

بہ جستجوئے تو ام مثل دانہ تسبیح
سپردہ ام بسر این راہِ گام فرسا را

دلم گداخت چو مینا ز ہولِ گرمی حشر
بہ بیں حرارت اندیشہائے فردا را

فتادہ ام بہ رہ شوق ہمچو نرگس زار
کہ آوریم بکف دامنِ مسیحا را

سراغ میکدہ دل گرفتہ ام از شاد
خبر کنید حریفان بادہ پیما را

مخمور فریب نظر تشنہ لب بیراے نظم
سراب آئینہ دار است حال دنیا را

اہم ۱۰

ن و نگاہ تو با کیف مئی چہ کار مرا
ن و بہار تو با فصل دی چہ کار مرا

بغیر صور بسر افیل محشر است اینجا
فغاں چو خیزد ہم از دل بہ نے چہ کار مرا

ن ذوقنا گری لذتِ جفائے حبیب
بہ شکوہ ستم پے بہ پے چہ کار مرا

فریب عشوہ دنیا نخوردہ ام مخمورم
بہ نار و غمزہ بیجاش ہے چہ کار مرا

ز بیخودی بہ گزشتم ز لا مکان و مکاں
بہ فکر ہستی لا شئے و شئے چہ کار مرا

بلند شد علم مہر و شبنم از جا شد
کہ با مسابقت ظل و فے چہ کار مرا

کنا چو دوست نہ شدی بس ضمان من بر تست
چنیں مگو کہ بہ کردار وے چہ کار مرا

جزائے ترک و فا ایں سعدی نشست ولے نہ گفت کہ با ملک رے چہ کار مرا

ق

بظل معدلت خسرو و کن اے نظم بعدل و سطوت کسریٰ و کے چہ کار مرا

وظیفہ ام رسد از خوان نعمت عثماں خلد اللہ ملکہ

بوصف حاتم طائی و طے چہ کار مرا

۲۴ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات ۱۲

دل راز عشق کا متحمل نہیں ملا سر سجدۂ نیاز کے قابل نہیں ملا

دریائے عشق پہ کے دو ہاتھ رہ گیا موج ضعیف تھا مجھے ساحل نہیں ملا

کیا جانے لطف عشق بجز بحث بے مزہ ناصح تجھے دماغ ملا دل نہیں ملا

محروم ہم ہیں عید سے بھی او جفا شعار اب بھی گلے سے خنجر قاتل نہیں ملا

جادہ ملا تمہارا شتہ تسبیح کیطرح آرام مجھ کو سیکڑوں منزل نہیں ملا

گردش سے ہم بھنور میں رہے جسطرح ہلال کشتی اگر ملی بھی تو ساحل نہیں ملا

کہتے پہ سب کے جبر گوارا کیا تو کیا کس کام کا ملاپ اگر دل نہیں ملا

ابرو کا اس کے دوسرا ابرو جواب ہے ایسا کسی کو مد مقابل نہیں ملا

انساں کا دل تمہارا امانت کو واسطے اس درد کا کوئی متحمل نہیں ملا

ہو کر نفس گسستہ کرے عرض شوق کیا اچھا ہوا کہ قیس کو محمل نہیں ملا

اک برق تھی کہ آگ لگائی نکل گئی بسمل پھڑک کے رہ گئے قاتل نہیں ملا

ہے ظلم نیمجاں پہ چھری تیز رات دن
قاتل کو دوسرا کوئی بسمل نہیں ملا

۳۴ — ۱۶

یا دش بخیر جلوۂ دلکش بہار کا
تھا یہ بھی شعبدہ کوئی لیل و نہار کا

پشتارہ لے چلا ہوں غم روزگار کا
گنبد ذرا بلند ہو میرے مزار کا

اونچا ہوا غبار جو اس خاکسار کا
پہنچا فلک کو گو نہیں صدمہ فشار کا

لو بوالہوس اور اہل جنوں کا مقابلہ
کیا توڑ ملا ہے اہل گریباں کے تار کا

ٹپکیگا خون برق کی لہروں سے باغ میں
ہے جوش میں لہو رگ ابر بہار کا

ہم تو کچھ اسطرح سے گرے پھر نہ اٹھ سکے
کیا پوچھنا غبار سر رہ گزار کا

حاصل نہیں ہے زیست کا جز رقص بیخودی
لو میں سمجھ گیا یہ اشارہ شرار کا

ہے لوٹنا پسند مجھے شاخ بید کا
ہے جھومنا پسند مجھے لالہ زار کا

دیوار پھاندنے کو ہے نشو و نمائے تاک
دامن پکڑ لیا ہے نسیم بہار کا

ہستی کا قافلہ ہے عدم کیطرف رواں
دور سپہر ایک تتق ہے غبار کا

مانو تو کچھ ہے اور نہ مانو تو کچھ نہیں
بازار دہر میں ہے چلن اعتبار کا

ہر دم ہے رم شماری پیہم سے دل کو کام
کھٹکا لگا ہوا ہے یہ روز شمار کا

نادان اپنے نفس پہ کرتا ہے آپ ظلم
شکوہ زبان پہ ہے ستم روزگار کا

اس زلف مشکبو کی سیاہی کہیں ملے
کالا کروں گا منہ میں شب انتظار کا

سجدہ کیلیے جبیں ہے ترے آستان پر — ہے عرش پر دماغ ترے خاکسار کا
شاہوں کو ناز تخت مرصع پہ ہے تو ہو — مالک ہوں میں بھی کلک جواہر نگار کا

۴۴

سینے میں دل ہو ڈیں کچھ ارماں نہو تو کیا — آنکھوں میں اشک اشک میں طوفاں نہو تو کیا
بیری یہاں نہیں ہے جو ساماں نہو تو کیا — داماں نہو تو کیا جو گریباں نہو تو کیا
دو دن کے واسطے سر و ساماں نہو تو کیا — سب کچھ تہی جو دل ہی میں ارماں نہو تو کیا
ہیکل پہ ہاتھ رکھ کے قسم کھا گئے ہیں وہ — بد عہد کے گلے میں جو قرآں نہو تو کیا
کیا اے فلک ملا ہمیں بازار دہر سے — ظالم متاع درد بھی ارزاں نہو تو کیا
لایا ہے کوئی ساتھ نہ لیجائے گا کوئی — دولت ہو اور عادتِ احساں نہو تو کیا
ہے قد سے قد ملا کے بہت سرو کو غرور — اس طرح ناز سے جو خراماں نہو تو کیا
تالو سے جب زباں نہیں لگتی جناب کی — ناصح بھلا دماغ پریشاں نہو تو کیا
راضی ہوں فصد خون نہ دے پیچ کیجیے — تسکینِ دل جو ھلیکی دوراں نہو تو کیا
سالک کو حق کے ڈھونڈنے ہی میں ہے کچھ مزا — اس راستے میں بھول بھلیاں[1] نہو تو کیا
دن میری زندگی کے گزر جائیں صبح تک — اتنا بھی طول اے شبِ ہجراں نہو تو کیا
رکھا نہ معصیت نے کہیں کا مرا حیف — بندہ ہو اور تابع فرماں نہو تو کیا
مانا کہ تو نے غیر کیا نظم اپنا حال — معلوم اس کو حال پریشاں نہو تو کیا

[1] بھول بھلیاں محاورہ میں مفرد مونث ہے ۱۲

مانا کہ تونے جوگ لیا دردِ عشق میں
اس حال پر بھی گر کوئی پرساں نہو تو کیا

یہ تو بتا کہ چاک گریباں سے فائدہ
جب تیرا ہاتھ اور اس کا گریباں نہو تو کیا

مانا کہ تیرے اشک میں گوہر کی ہی چمک
عارض پہ اسکے وصل کے غلطاں نہو تو کیا

اچھا یہی سہی کہ وہ محشر خرام ہے
تلووں کے نیچے دیدۂ حیراں نہو تو کیا

یوں خاک و خوں میں لوٹ گئے تم تو کیا حصول
قاتل کا اپنے ہاتھ میں داماں نہو تو کیا

جھک جھک کے ڈھونڈتا ہی عبث اس گلی میں تو
اس خاک میں ترا دلِ نالاں نہو تو کیا

جاتا ہے اسکے در پہ تو اتنا سمجھ تو لے
گر تیرے روشناسوں میں درباں نہو تو کیا

گر اذنِ عام غیر کو ہے تو ہوا کرے
تیرا گذر وہاں کسی عنواں نہو تو کیا

کہتے ہو جو پڑے گی مصیبت اٹھائینگے
لیکن وہ ظلم کرکے پشیماں نہو تو کیا

سوچے ہو جان دینگے جو دشوار ہوگا وصل
مرنا بھی میری جان جو آساں نہو تو کیا

۵۴ ۱۱

بندہ کسی طرح نہ سزائے جحیم تھا
یارب میں روسیاہ سہی تو کریم تھا

کوٹھے پہ آکے نعش کا جانا تو دیکھ لے
لے اٹھ گیا جو تیری گلی میں مقیم تھا

واعظ خدا کے واسطے اس ابر کو تو دیکھ
پیتے اگر نہ مے تو گناہِ عظیم تھا

کیا کرتے ہم کہ ضبط سے گھبرا گیا تھا جی
کھینچی اک ایسی آہ کہ بس دل دو نیم تھا

نازک ہے انتہا کا دماغِ فسردگی
ہمکو تو سر اٹھانا ہی بارِ عظیم تھا

دنیا کے نعمتوں میں برابر کا زہر ہے
اصلاح تو یہ دیکھئے آخر حکیم تھا

ایک ہم تھے اور پرسش اعمال قبر میں
آخر کوئی رفیق نہ کوئی ندیم تھا

دنیا سے دل اٹھا کے عجب سیر دیکھ لی
اک دوش پر جنازہ کہ امید و بیم تھا

ساتوں فلک نہ بار امانت اٹھا سکے
ہم نے اٹھا لیا وہ جو بار عظیم تھا

اے آسمان میری تباہی روا نہ تھی
تھا خاک بھی تو خاک رہ مستقیم تھا

اے نظم خوب راہ نمائی جنوں نے کی
گلشن سے دشت ایک خط مستقیم تھا

۴۶ ——— ۱۵

ہیں پا کے اس سے عفو کا پروانہ چھٹ گیا
اہل خرد دھرے گئے دیوانہ چھٹ گیا

کیا حال پر ملال شب غم بیاں کروں
ظلمت وہ تھی کہ شمع سے پروانہ چھٹ گیا

آئی تھی اب مزہ پہ کہانی شباب کی
کس لطف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا

کس راستہ سے ناقہ لیلیٰ کو لے چلا
اے ساربان قیس کا ویرانہ چھٹ گیا

مستی میں ایک کی تہ رہی ایک کو خبر
شیشے سے بزم عیش میں پیمانہ چھٹ گیا

کاجل لگا کے لاش پہ رونے کو آئے تھے
اشکوں سے رنگ نرگس مستانہ چھٹ گیا

تو اضطراب شوق بھی نکلا حریف ہم
چٹکی میں آکے شمع کی پروانہ چھٹ گیا

قابو سے نفس بد کو نکلنے نہ دے کبھی
پھر شیر ہے جو یہ سگ دیوانہ چھٹ گیا

دیکھا فریب حیرت بزم وصال کا
دست مژہ سے سبحہ صد دانہ چھٹ گیا

دی آکے کیا نسیم نے حیرت فزا خبر
ہر شاخ گل کے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

تھا وصل روح و تن نفسِ واپسیں تلک
دم بھر میں ایک عمر کا یارانہ چھٹ گیا

احسان یہ کیا عرقِ انفعال نے
دامن سے داغ گریۂ مستانہ چھٹ گیا

واعظ بتا مجھے کہ یہ کس کی نظر لگی
ہونٹوں تک آکے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

زاہد جو شہر چھوڑ کے صحرا نشیں ہوا
اس کو یہی قلق ہے کہ میخانہ چھٹ گیا

رکھا ہے کیا وطن میں اب اے نظمِ خستہ جاں
ہوا سلیے اودا اس کہ ویرانہ چھٹ گیا

۴۷ —— مفعول فاعلاتن دو بار —— ۴۱

پرسش جو ہو گی تجھ سے جلاد کیا کرے گا
لے خون میں نے بخشا تو یاد کیا کرے گا

ہوں دام میں پریشاں اور سادگی سے حیراں
کیوں تیز کی ہیں چھریاں صیاد کیا کرے گا

ظالم یہ سوچ کر اب دیتا ہے بوسۂ لب
جب ہونٹ سی دئے پھر فریاد کیا کرے گا

زنجیر تار داماں ہے طوق اک گریباں
زورِ جنوں نہ کم ہو حداد کیا کرے گا

ہم ڈوب کر مریں گے حسرت رہیگی تجھ کو
جب خاک ہی نہ ہوگی برباد کیا کرے گا

یعقوب قطع کر دیں امید وصل دل سے
یوسف سا بندہ کوئی آزاد کیا کرے گا
دل لے کے پوچھتا ہے تو کس کا شیفتہ ہے
بھولا ابھی سے ظالم پھر یاد کیا کرے گا
اے خط بیاض عارض درکار ہے جو تجھ کو
تحریر حسن کی کچھ روداد کیا کرے گا
کنج قفس سے اک دن ہوگی رہائی اپنی
مر جائیں گے تو آخر صیاد کیا کرے گا
مثل سپند دل ہے بیتاب سوز غم میں
رہ جائے گا تڑپ کر فریاد کیا کرے گا
اے شیخ بھر گیا ہے کیوں وعظ کی ہوا میں
ریش سفید اپنی برباد کیا کرے گا
ظلم و ستم سے بھی اب ظالم نے ہاتھ کھینچے
اس سے ستم وہ بڑھ کر ایجاد کیا کرے گا
ازبسکہ بے ہنر ہوں میں ننگ معترض ہوں
مضموں پہ میرے کوئی ایراد کیا کرے گا
اے نظم جس کو چاہے وہ دے بہشت دوزخ

نمرود کیا کرے گا شداد کیا کرے گا

۴۸ —— فاعیل مفاعیل مفاعیل فعاعیل —— ۲۰

واعظ نے درِ کعبۂ عرفاں نہیں دیکھا
عارف نے صنم خانۂ امکاں نہیں دیکھا

جی بھر کے ابھی جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
تم نے اسے اے موسیٔ عمراں نہیں دیکھا

گلشن نہیں دیکھا کہ بیاباں نہیں دیکھا
جمعیتِ دل کا کہیں ساماں نہیں دیکھا

یہ آئینہ خانہ ہے طلسماتِ خودی کا
ویراں سے دیکھا کبھی تو ویراں نہیں دیکھا

دل تا لبِ خاموش ہے نالہ کی گذرگاہ
گردوں کو حریفِ خمِ چوگاں نہیں دیکھا

پھر رک نہ سکیں گی یہ جوانی کی امنگیں
روکو ابھی توسن نے بیاباں نہیں دیکھا

زاہد کی کمیں گاہ سے واقف ہے بھلا کون
کیا جانے وہ جس گرگ نے باراں نہیں دیکھا

کیا جانے پریشانیٔ خاطر وہ کسی کی
اس نے تو کبھی خواب پریشاں نہیں دیکھا

پہنچا ہی نہیں منزل پہ ملی جس کو رہِ راست
اس کو کبھی افتاں کبھی خیزاں نہیں دیکھا

آساں جسے سمجھے اسے آساں ہی پایا
مشکل جسے سمجھے اسے آساں نہیں دیکھا

دم لے کے ذرا راہ میں جنگل میں اٹھاں
کوسوں تجھے اے عمرِ گریزاں نہیں دیکھا

رہ رہ کے اڑی خاکِ سلاطینِ سلف کی
گردوں سے کبھی دستِ گریباں نہیں دیکھا

جس تیر نے پلہ نہ کیا ہے وہ پرِ کاہ
بیکار ہے جس تیغ نے میداں نہیں دیکھا

واہی ہے حقیقت میں پھرا ہی نہ جانے
ایسا بھی جنوں خیزِ بیاباں نہیں دیکھا

ہے تجلکدۂ دہر میں حیرت کی تجلی
نرگس نے کبھی سایۂ مژگاں نہیں دیکھا

ستوں کے لئے رشک کی جا ہے سفر برق — جز ابر سیہ اور شبستاں نہیں دیکھا
کیا حال گلستاں کا جو بھولے نہ خزاں بھی — طاؤس کو اس طرح پر افشاں نہیں دیکھا
ہے سایہ فگن فرق پہ گرد قدم اپنی — پھرتے ہوئے یوں چتر سلیماں نہیں دیکھا
وحشت میں بھی پابند رہا وضع کا اپنی — کوچہ کوئی جز چاک گریباں نہیں دیکھا

کیا پوچھنا اے نظم اس آزادہ روی کا
یوں سرو کو بھی برزدہ داماں نہیں دیکھا

سب دل کا بخار آنسوؤں کے تار نے کھینچا — آندھی کو رگ ابر گہر بار نے کھینچا
ہر اشک کے سیلاب میں جھنکار کی آواز — پرکالۂ دل گریۂ سرشار نے کھینچا
نقشہ نہ کھنچا خواب پریدہ کا کسی سے — کھینچا تو مرے دیدۂ بیدار نے کھینچا
ایسی ہی ترے ہاتھ کے بوسے کی تمنا — اس شوق میں چلہ لب سوفار نے کھینچا
شق القمر انگلی کے اشارہ سے دکھایا — قشقہ جو ہے آئینہ رخسار نے کھینچا
کن کن ثمروں کو قد موزوں نے سنبھالا — کس بوجھ کو شاخ ثمر یار نے کھینچا
بگڑے بھی کبھی جنگ ہی سے گیسوئے عنبر — نالہ کبھی پازیب کی جھنکار نے کھینچا
چھپ چھپ کے کبھی رو دیا تو گنہگار ہوا میں — محشر میں گریباں مرا دلدار نے کھینچا
سینہ اور اپنے داغ ہیں افشاں کا ستارہ — کاکل سے رہائی ہوئی رخسار نے کھینچا
مجنوں کو پھری وحشت او ڈھی یہ چسکا ہے — کانٹا جو چبھا پاؤں میں خوئے دیار نے کھینچا

[illegible] تو گئے سرِ فن — اور میں یہ کہوں خاک کو برباد نہ کرنا

پھول کی [illegible] کھل کے بھی پھولی — نالہ بھی اے مرغ چمن زار نہ کرنا

تم سے جو اس طرح پہ کرتے ہیں ملاقات — ہم ظلم کریں تم پہ تو فریاد نہ کرنا

نا قدر سمجھتے ہیں تو آتا ہے مجھ کو — تو قتل میں جلدی کا ہمیں صاد نہ کرنا

سمجھے بھی جادو ہے زبان بلبل کا — دیکھو مرے اشعار پہ ایراد نہ کرنا

بندہ تو [illegible] سمجھتا ہی ترے ہاتھ — لیتا ہے اگر مول تو آزاد نہ کرنا

اور وعدہ خلافی پہ تغافل کی قسم ہے — آ عمر مجھے بھول کے بھی یاد نہ کرنا

اے نظم عجب لطف ہی دیوانہ ولی میں
ہاں ترک کبھی عشق پری زاد نہ کرنا

ا — فعلاتن مفاعلن فعلات — ۱۶

کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا — اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا

آفت [illegible] کی آشنا کے دیکھ لیا — تم نے چھریاں لگا کے دیکھ لیا

دل کو تلووں سے مل کے وہ بولے — پھول ذرا تلملا کے دیکھ لیا

دیکھ سکتے تجھے آنکھ سے نہ جسے — اس کو دل میں چھپا کے دیکھ لیا

پھول سے ہیں سبک قدم اس کے — میں نے آنکھیں بچھا کے دیکھ لیا

حال اس شوخ نے مرے دل کا — کیا نظر میں سما کے دیکھ لیا

مجھ پہ احسان ہوا نزاکت کا — تو نے گر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا

دیکھنا ہی نہ تھا او صرِ دل زار | تیرے کہنے میں آ کے دیکھ لیا
دھجیاں آستیں کی کہتی ہیں | ہاتھ پھاڑ ہا کے دیکھ لیا
مرگیا میں سمجھ کے پیچ اس کو | کیوں بہانہ بنا کے دیکھ لیا
ایک ہی ہاتھ کا تھا سارا جہاں | ہاتھ ہم نے اٹھا کے دیکھ لیا
کچھ نہ سمجھا کہ اس نے جاتے وقت | ہائے کیوں منہ پھرا کے دیکھ لیا
کچھ کدورت ہی سی کرتا ہے | دل کے ٹکڑے اڑا کے دیکھ لیا
نزع میں تجھی ملا جو نامہ یار | اُٹھ کے بیٹھا اٹھا کے دیکھ لیا
دل کی چوری بھی کھل گئی سب پر | آنکھ تم نے چرا کے دیکھ لیا

نہ ہوا داغ کا جواب اے نظم
طبع کو آزما کے دیکھ لیا

کام آخر نہ ہونا تھا نہ ہوا | فکر کا ہے کی اب ۔ ہوا نہ ہوا
خاک پا ہو کے نقش پا نہ ہوا | تیرے قدموں سے میں جدا نہ ہوا
دل تو دیتا ہے تجھے یارب | اور اگر ورد آشنا نہ ہوا
حسن اس کا نہ آنکھ دیکھ سکی | سات پردے تھے سامنا نہ ہوا
ہم کو کہنا تھا جو وہ کہہ گزرے | دل میں قائل ہوا وہ یا نہ ہوا

لہ زمین انہی مرحوم کی نکالی ہوئی ہے ۱۲

اڑ رہا ہوں غبار ہو ہو کر | زور پروازِ جستجو نہ گیا
نظمؔ اس سال بھی زیارت کو
جانے والے تھے لوگ تو نہ گیا

۸۴ | ۱۱

خیال و خواب سا گذرا نظر مثل سراب آیا
یہی جلدی تھی جانے کی تو کیوں عہد شباب آیا
کہاں لے نظمؔ لے کر کاروانِ صبر و تاب آیا
جہاں اسوار طوفاں موج خیز اضطراب آیا
شب غم میں ستاروں کے لیے روز حساب آیا
مری اختر شماری کو سمجھتے ہیں عذاب آیا
سحاب تیرہ لے کر خیمۂ مشکیں طناب آیا
اور اس ظلمات میں ساقی نہ لے کر آفتاب آیا
عبث کی گردش افلاک نے گہوارہ جنبانی
نہ دل ٹھہرا نہ غم بھولا نہ موت آئی نہ خواب آیا
نکل اے جان مضطر میں بھی اب ہوں ہمعنان تیرا
ٹھہر اے عمر رفتہ میں بھی تیرے ہم رکاب آیا
فلک اندر فلک ہے کائنات اس بزم عالم کی

عشرت کا پیمانہ حباب اندر حباب آیا

جواہر ریزہے گردوں طرب انگیز ہے ہاموں
شفق سے شیشہ شبنم میں یاقوت مذاب آیا

قدم سے طاقت رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہ کر
میں اب جھجک جھجک کے چلتا ہوں کہ سن لو کیا جواب آیا

شب غم ہجر پوچھو دم نکلنے میں ہے کیا لذت
اجل اس طرح سے آئی کہ میں سمجھا کہ خواب آیا

نہ ہے قسمت سے خنجر کیا جی بھر کے نظارہ
نہ بسمل کی پلک جھپکی نہ قاتل کو حجاب آیا

نہ جا میخانہ میں اسے ظلم ہم تجھ سے کہتے تھے
وہاں سے ہو کے گم ہوش و سیہ مست و خراب آیا

حرف (ب)

۵۵ ۱۵

اٹھا ہوں مثل گرد قدم کی صدا سے اب
شاہی احتیاج کا داغ التجا سے کب
ہستی کو جھیل جا تو سعادت شکار ہے
ہرگز گھٹا نہ عشق رہ مستقیم کا

پاؤں لگا قافلہ کا نقش پا سے کب
او بہرہ کار آگ بجھی ہے ہوا سے کب
خالی ہے اس بہار کی چھل ہا سے کب
سر کا یہ آفتاب خط استوا سے کب

کب ہوگا برطرف غم و اندوہ اے کریم
پانی سفید ہوگا کالی گھٹا سے کب

فریاد کس سے کیجیے گردوں کی دور میں
نکلی پسے ہوؤں کی صدا آسیا سے کب

تو بھی تو ہمرکاب تھا اے شوق کوئے یار
پیچھے میں رہ گیا ہوں صدائے درا سے کب

ہوتی ہے آبرو کہو کیا حرص میں فروغ
گھٹتی ہے موج آب گہر میں ہوا سے کب

ہے اس طرف ہر ایک رگ جاں کھنچی ہوئی
پیوند گاہ کو ہے بھلا کہربا سے کب

پہنچی ہے ٹھیک وقت پہ بجلی تنک گھٹا
کیا جانیے چلی تھی یہ کوہ صفا سے کب

دو نسخ ہی ہیں گر ایک لیجائے نقش شوم
یہ پوچھتا ہے راہ کسی رہنما سے کب

کیا جانیے کب طلسم خودی سے نجات ہو
نکلے یہ عکس آئینۂ ماسوا سے کب

ہم کو نقاب نام کی بھی چھوٹی سی نہ ہو
دھویا تھا ہاتھ خضر نے آب بقا سے کب

جب دل کو ظلم سہنے میں آنے لگا مزہ
توبہ وہ کرنے بیٹھے ہیں جور و جفا سے کب

نکلے گا دل سے نظم کے کیونکر غم حسین
جاتا ہے رنگ لعل سے سرخی حنا سے کب

۶۵ — ولہ — ۹

کوئی مئے دے یا نہ دے ہم رند بے پروا ہیں آپ
ساقیا اپنی بغل میں شیشۂ صہبا ہیں آپ

غافل و ہشیار ہو و تمثال یک آئینہ ہیں
ورطۂ حیرت میں ناداں آپ ہیں دانا ہیں آپ

کیوں نہ ہے میری دعا منت کش بال ملک
نالۂ مستانہ میرے آسماں پیما ہیں آپ
نہ تعجب خضر کو اور آب حیواں کی طلب
اور پھر عزلت گزین دامن صحرا ہیں آپ
منزل طول امل پیش اور رہ طاقت ہے کم
راہ کس سے پوچھئے حیرت میں نقش پا ہیں آپ
حق سے طالب وصل کے ہوں ہم بصیر اپنے نہیں
ہم کو جو کوتہ نظر سمجھیں وہ نابینا ہیں آپ
گل ہمہ تن زخم ہیں پھر بھی ہمہ تن گوش ہیں
بے اثر کچھ نالہائے بلبل شیدا ہیں آپ
جس سے شکوہ کروں کیا ہاتھ پھیلاتے ہیں
کہتی ہے وہ اپنے ہاتھوں خلق میں رسوا ہیں آپ
ہم سے اے اہل ستم منہ چھپانا چاہیے
دم بھرا[1] کرتے ہیں ہم اور آئینہ سیما ہیں آپ

حرف (ت)

[1] دم سے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے ۱۲

اک مشت استخواں پہ گناہوں کا بوجھ ہے
نقشہ چمن میں غفلت اہل جہاں کا ہے
ہم کو بھی مل رہیگی کسی سنگ تن کی [illegible]

تھا اس نحیف و زار کو بار کفن بہت
اترا رہے ہیں پھول ہیں گر کفن بہت
جوہر شناس سیکڑوں ہیں اہل فن بہت

٥٩ ولہ ٣٧

پرتو حسن تو در آئینہ تا افتادہ است
شور با و من بہ ترہم ماسوا افتادہ است
آئینہ در ورطہ از جوش صفا افتادہ است
طبع روشن ہر کہ میدارد زپا افتادہ است
کوچہ زلف و شب دیجور در تاریک تار
دل بیفتاد و نمیدانم کجا افتادہ است
شکوہا دارم زانداز گران جانی خویش
ہست چوں سنگے کہ در راہ وفا افتادہ است
کشتی صبرم بطوفان ہوا افتادہ بود
بر کنار اینک بہ موج بوریا افتادہ است
سایہ بر خورشید افتادست از زلف سیاہ
شعلہ در آئینہ از رنگ حنا افتادہ است
انس بگرفتم زبس با خانہ ویرانی خویش

سبزۂ بیگانہ با من آشنا افتادہ است

شرمسارم عذر بدتر از گناہ آوردہ ام

پردہ بر بشکے من از دست دعا افتادہ است

شور یارب بر لب و دست تظلم بر فلک

شیشۂ صبر من از بام دعا افتادہ است

من ہمہ تن گوش باشم بر صدائے الرحیل

در دو چشم گرد آواز درا افتادہ است

ماندگی پائے من سیلے کہ بر من بستہ بود

بر سرم از صدمۂ شور درا افتادہ است

برق را گفتم مجوز ہستی راہ گریز

از میان جست و در آغوش فنا افتادہ است

چون الف آہے کشم و زہستی خود بگذریم

در کمند وحدتم صید فنا افتادہ است

گردش نہ آسمان یک دل نالان من

دانہ ہمت و بدست آسیا افتادہ است

انقلاب چرخ نتواند مرا از جا برو

من ولے دارم کہ قطب آسیا افتادہ است

باز آمد تشنہ کام از بسکہ اسکندر بدید
بیضہ اندر چشمۂ آب بقا افتادہ است

نسبتے دارد حدوث دہر با لوح قدم
ہمچوں آں نقشے کہ بر آب بقا افتادہ است

ہر قدر نزدیک تر آید بگردد دور تر
سالک راہش برہ چوں نقش پا افتادہ است

سرنگوں گشتم ز پیری من کجا و فکر شعر
طرفہ مضموں بلندے پیش پا افتادہ است

سید ہد جام فنا بر کف صلا ضحاک دہر
دور جم آخر شد و نوبت بما افتادہ است

نقد فرصت را بیغمامی برد نفس حریص
حیف ازیں فرصے کہ در کالائے ما افتادہ است

ناروائی ہست آفریں و کان اہل فن
نقد معنی چوں متاع ناروا افتادہ است

کہکشاں با کج روی تا آسمانہا سر کشید
بر زمیں چوں نظم خط استوا افتادہ است

بسکه جوش اضطراب شوق برق خرمن ست
تا تو در یادی مرا من نیستم خاک من ست

از غم عشقش بیاسایم تنِ ایں کار من ست
خوش بیفروزیم آتش تا هوا و روامن ست

تا مرا تاب و توان و هوش خرمن خرمن ست
جمله وقف انتظار شوق برق ایمن ست

از کواکب بر سر ما ریخت گردون فتنه‌ها
چرخ گردان آسیا مه ست و سهم پرویزن ست

وه همه هستی بسکه چشمت را غبار آلود کرد
تا تو می بینی مرا من نیستم گرد من ست

مو سیاه و ارفتگان گفتگوی یار را
در صدای لن ترانی موج برق ایمن ست

کاروان اشک خون بی گذر بگذشته دوش
نقش پایش از سر مژه تا دامن است

نکهت گل را بگفتم سخت می پوشی چرا
گفت مجبورم مرا خون وفا بر گردن ست

از هجوم ظلمت اندوه و غم [illegible]

بعد شب صبح است و بعد از صبح روز روشن است

اسراغ حق ہمی گیریم از نامحرماں
کاندریں وادی چراغ راہ چشم رہزن است

درس عبرت را ازیں سیر طریقت یاد گیر
چنگ در بزم طرب محو فغاں و شیون است

میکشد در رہ ترا ایں سعی بجائے سیند
نردبان دود دل کوتہ ببام شیون است

طے کند صد سالہ رہ از برگ گل تا آفتاب
بہر شبنم ایں کرامتہا ز قلب روشن است

حاصل عمر خود از بہر تماشا سوختی
نظم ایں جوشش طرب رقص شرار خرمن است

۶۰ — ولہ — ۴

عشق از سوز دل میں طرح آتش خانہ ریخت
آتشے از آتش گرفت و درد دل پروانہ ریخت

کشتۂ آں ترک ستم کز سر ناز و غرور
کافرم پنداشت و خونم چو بے باکانہ ریخت

چارہ بے خوابیم ناید ز تواے قصہ خواں

۶۳ — وله — ۱۱

کامگار است هر که ناکام ست　　زانکه گیتی طلسم اوهام ست

بدمگو هر که را که بدنام ست　　نام او خود بجای دشنام ست

فال باده کشی مزن واعظ　　خط پیمانه حلقهٔ دام ست

دین و دنیا بهم نخواهد رفت　　طمع پخت و سر سبز خام ست

انفعال گناه و حسرت دید　　چشم بر پا و جاده بر بام ست

گرد باد هم در راه کوچهٔ دوست　　نیت با طواف و احرام ست

آستانش کجا و سجدهٔ ... ما　　بوسهٔ عاشقان به پیغام ست

اصل گیتی ست جوشش بادهٔ عشق　　کهکشان حلقهٔ خط جام ست

جست از جا سپند و رمزی گفت　　کز عدم تا وجود یک گام ست

بنده آن کسم که در عالم　　نیک کردار و نیک فرجام ست

نقطه دانسته ام بعمر سپهر　　صبح آغاز و شام انجام ست

۶۴ — قطعه — ۵

مرکب ماست کوکب سیار　　از مسیرش سنین و اعوام ست

او درین راه خویش غلطنده　　شام تا صبح صبح تا شام ست

تا هلال از هلال یک منزل　　تا صباح از صباح یک گام ست

که قریب است و گه بعید از شمس / قرب و بعدش فصول ایام است
گر چه بینیم ماهمی بینیم / که زمین فرش و آسمان بام است

۱۵۷ — مشاعره صدر اعظم بهادر — ۹

همه زخم و درون زلفش شکن اندر شکن است / در خم هر شکنش نافهٔ مشک ختن است
بهار است که پری خانه به مینا داریم / جنبش بال پری موج شراب کهن است
گشت عمر و ز چمن دور و اسیر قفسیم / در دلم نقش هواخواهی سرو و سمن است
خواستم تا قو ز زلفش بکشایم در باغ / گفت هشیار که غماز نسیم چمن است
بسکه بیگانه ام از صحبت ابنای زمان / به سرم گرد غریب الوطنی در وطن است
ابر بی گوهی عمر تو می گرید زار / برق ازین ره که تو غافل گذری خنده زن است
قطره‌ها بود زمین غرق بخون ناحق / شاهد راز درون لاله خونین کفن است
غزل شاد که سالک هرش می گویند / شهرهٔ حسن قبولش ز دکن تا عدن است
برتری از دگران اهل سخن را است بجا / جوهر ذاتی انسان سخن است و سخن

۶۶ — وله — ۷

آورد عرض بار امانت چنان شکست / پشت سپهر تا کمر کهکشان شکست
موجے چو سیل سر زده از قلزم شهود / در وادی سپهر کران تا کران شکست
سنگ ز فراق و گریهٔ شبهاے تا رحیف / بنیان شمع از سر تا استخوان شکست
پیر مغان براه کرم جرعهٔ بداد / کز نشئهٔ خمار هستی من جاودان شکست

خم گشت پشت مرد و بدل آرزو ہنوز — ترکش ہنوز نا شدہ خالی کماں شکست
ایں قید و بند بود پے مرغ روح من — تا من رہا شدم قفس استخواں شکست
مرغے بہ پیش ابرہہ رفت و صد انگزد — از سنگ ریزہ گردن پیل دماں شکست

۶۷ —— ۱۹

حرف ح

دور کھینچے نہ گریباں کی طرح — لوٹ جاؤنگا میں داماں کیطرح
پاؤں پھیلائے ہیں داماں کیطرح — ہاتھ کھینچا ہے گریباں کیطرح
چل گیا مجھ پہ یہ دوسرا خنجر — پھر گئی آنکھ بھی مژگاں کیطرح
تیرے عاشق کا یہ دل تھا ظالم — توڑ ڈالا جسے پیماں کیطرح
سر جھکا کر نہ اٹھایا ہم نے — تیغ آئی تیرے احساں کیطرح
میرے غماز کا ہے منہ کالا — میرے ہی نامۂ عصیاں کیطرح
کھاتے ہیں ترک محبت کی قسم — ہاتھ اٹھاتے ہیں وقیراں کیطرح
اے قناعت ترے صدقے ہو جاؤ — میں ہوا پر ہوں سلیماں کیطرح
پر کدورت ہے دل زار ایسا — خاک اڑتی ہے بیاباں کیطرح
مجھ کو حیرت ہے کہ خورشید بھی ہے — زر فشاں جلوہ عثماں رضی اللہ عنہ کیطرح
نظم کے پاس تھا کیا دل کے سو — کھو دیا اس کو بھی ایماں کیطرح

کیا تھا ابر نے نالہ میری فغاں کیطرح
زمین نکل گئی قدموں سے آسماں کیطرح

الٰہی آج کا ابر اسقدر تو جھک آئے
کہ ڈھانک لے درِ میخانہ سائباں کیطرح

دکھا رہی ہے مجھے بیخودی نیا عالم
جہاں زمین کیطرح ہے نہ آسماں کیطرح

کوئی نشاں نہ ملا کسطرف گئے احباب
بھٹکتے رہ گئے ہم گردِ کارواں کیطرح

نزولِ رحمتِ باری ہے آج کثرت سے
گرا بر کشتئ مے پر ہے بادباں کیطرح

دل و جگر کبھی کا جسکو یوں تڑپتے تھے
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی سناں کیطرح

جہاں میں صاحبِ ہمت کی یہ نشانی ہے
عروج پائے تو جھکنے پر آسماں کیطرح

سوا انہوں کے ہستی دہر کچھ بھی نہیں
یہ حلقہ ہیچ ہے خالی ہے کہکشاں کیطرح

۶۸ ۱۰

اس مہینہ بھر کہاں تھا ساقیا اچھی طرح
آ ادھر آ عید تو مل لیں ذرا اچھی طرح

انگلیاں کانوں میں رکھ لے اے مسافر سن ذرا
آ رہی ہے صاف آواز درا اچھی طرح

چشمِ موسیٰ لا سکی اک تاب اوسکے جلوہ کی نہ تاب
چشمِ دل سے جسکو دیکھا بارہا اچھی طرح

فاصلہ ایسا نہیں کچھ عرش کی زنجیر سے
کیا کہوں اٹھتا نہیں دستِ دعا اچھی طرح

اہلِ صورت کو نہیں ہے اچھی سیرت سے غرض
اچھی صورت چاہئے اچھی ادا اچھی طرح

قتا ہدان لالہ و گل کی خبر لائی ہے کچھ
سال بھر کے بعد آئی اے صبا اچھی طرح

سیکھ لیگی بل کی لینا تا کمر آنے تو دو
بل ابھی کرتی نہیں زلفِ دوتا اچھی طرح

شیشہ و جام و سبو بھر لے مے گلرنگ سے
آج ساقی گھر کے آئی ہے گھٹا اچھی طرح

۱۱

حرف د

نظر پڑا جو مجھے دام شک بو صیاد
ہوئی ہے دل کو اسیری کی آرزو صیاد

نہ بو سے گل سے غرض ہے نہ صوت بلبل سے
تو باغباں ہے مخالف ہے عدو صیاد

چمن میں تجھ سے اسیری کا ہر طرف تھا ہجوم
نکل سکی نہ مرے دل سے آرزو صیاد

یہ آرزو بھی نہ پوری ہوئی اسیری کی
سنائیں اپنی کہانی سنے جو تو صیاد

ہو گل فروش ادا ہی تو پوست ہی کھینچیں
وہ آج صید میں اور جوش آرزو صیاد

کیا ہی لطف اسیری نے مست بلبل کو
قفس ہے کیا مجھے گلرنگ کا سبو صیاد

لپٹ کے سرو سے قمری یہ ہی تو کہتی ہے
پھری تلاش میں پھرتے ہیں کو بکو صیاد

گرہ ہوئی ہیں رگ ڈور سے جا بجا نالے
گلوئے نے کی طرح ہے مرا گلو صیاد

قفس میں بلبل کو یاد چمن کی یہ گل کھلائی ہے
بنا ہے لالہ و گل خون آرزو صیاد

فغاں نکل نہ سکی گھٹ کے میں تمام ہوا
گلے کی ہو گئی پھانسی رگ گلو صیاد

نہیں تو اپنی رہائی سے یاس ہے ظالم
کہ ہے غضب کا فسوں ساز و حیلہ جو صیاد

۱۰

آئینہ از پرتو او وادی ایمن شود
چشم آہو از نگاہش دیدہ روزن شود

حیف ازاں ساعت کہ خود نفس تو آہرمن شود
خوشتر آں کس کو رہا از بند ما و من شود

عشوہ او تیغ چوں بر من کشد ہنگام وصل
از دو گیسویش گرہ بکشائم و جوشن شود

اے کہ شمع مدفنم گشتی توقف کن کہ تا
شمع کشتہ باز از سوز دلم روشن شود

اف ازیں سوزِ نہانیہا کہ دل را خاک کرد
ہمچوں آں پرکالۂ آتش کہ در گلخن شود

نیست امکاں مفر از کوچۂ گیسوئے او
جادہ بر خود پیچد و چوں افعیم رہزن شود

مایۂ صد گمرہی باشد دلِ صد آرزو
رہگذارش را چراغ از چشم آہرمن شود

کس نمی پرسید از حال من اے برق بلا
خندۂ بر من زدی اے چشم تو روشن شود

بادیہ گردی من پوشید عریانی من
گرد رہ در رہ قدم بر خیزد و دامن شود

لذتے دارم چناں از کاوش مژگاں تو

شبنمم نشتر بدل گر نالۀ شیون شود

۷۲ ۱۲

جوش سرشک تا سر مژگان نمی رسد / وا از خون دیده گل بگریبان نمی رسد

بالا تر است جلوهٔ او از فراز عرش / آنجا نگاه موسی عمران نمی رسد

تا آنکه خود فنا نشود در رهٔ طلب / شبنم به اوج نیر تابان نمی رسد

ابر سیاه در نظر جذبهٔ شوق است / این گرد سرمه تا به صفاهان نمی رسد

زنجیر عرش هست و ندانم ز بهر چیست / آنجا که دست سلسله جنبان نمی رسد

دیدند اهل دل ثمر قد کشی سرو / آری سر غرور به سامان نمی رسد

تا دست و پا بموج تبسم نمی زند / طفل شگوفه تا گل خندان نمی رسد

در کاروان و بند بازند یوسفی / گرچه برآمدست و بزندان نمی رسد

دامن کشان گذشت ستمگان خویش / دست کسی بگوشهٔ دامان نمی رسد

ماتم و طوف دشت و بیابان چو گرد باد / دین خاک ماتم گریزان نمی رسد

بی راهبر مباش که این کاروان گل / بی سعی نامیه به گلستان نمی رسد

هر چند تیز گرد بود دانهٔ شبه / اما بآب گوهر غلطان نمی رسد

بدام این نفس از افسون نه از افسانه می آید
چنین کار سترگ از همت مردانه می آید

بیک اشک ندامت مزرع اخلاص شاداب است
سر شاخ مژہ خرمن بدوش ایں دانہ می آید

دہد تا فسردہ جام صبوحی مے پرستاں را
بیک شب گیر ابر از کعبہ تا میخانہ می آید

اگر ضبط نفس شرط است در میخانہ عرفاں
کہ بے قلقل شراب از شیشہ در پیمانہ می آید

عیاں از اضطراب شعلہ شمع است ایں معنی
ہوائے خوش زباں افشانی پروانہ می آید

براہ دوست عاشق از سر جاں بگذرد آرے
بسر غلطیدنی از گوہر یک دانہ می آید

فغاں از مستی ساقی کہ دیدم کشتی مے را
کنار جو بموج لغزش مستانہ می آید

دریں زنداں تن از دم شمردنہا نیاسایم
نسیم جانفزا از کوچہ جانانہ می آید

سزد گر سر کشد از بندگی نفس
بشر در عالم ایجاد آزادانہ می آید

ز حد خود گذشتن نیست کار بادہ پیمایاں

کہ جوشِ بادہ ایں جا تا خطِ پیمانہ می آید

بگردوں تیرہ ابرے بر شد و مستند میخواراں
کہ پندارند بر دوش ہوا میخانہ می آید

ز احوالِ سویدائے دلِ مضطر چہ می پرسی
کہ چوں اسپند در پرواز بیتابانہ می آید

ز پاسِ وضعِ رنداں نگذرم تا اندریں محفل
اقامت از صراحی گردش از پیمانہ می آید

فروغِ حسن داشد نا گزیر اسبابِ رسوائی
کہ ہر جا شمع روشن می شود پروانہ می آید

کلامِ بے ہنر از گنجِ معنی ہست بے بہرہ
صدائے بوم را ماند کہ از ویرانہ می آید

نمی آید ز ہر کس رام کردن نفسِ سرکش را
چنیں کارِ سترگ از ہمتِ مردانہ می آید

فراشش تا کنم اے نظمؔ از دل گریہ مینا
بگوشِ من صدائے خندہ پیمانہ می آید

حرف ر

فاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات

نہیں مقام کا اس جلتی چھاؤں میں موقع
نہ بیقرار ہو مرنا پہنچ کے منزل پر

ملا طریق وفا میں جو کوئی سنگ گراں
اٹھا کے راہ سے میں نے وہ رکھ لیا دل پر

نگاہِ ناز کا مطلب ہے کیا نہ کچھ سمجھا
چھری جگر پہ کوئی اب لگائیے یا دل پر

ہزار شکر کہ افعال میں تو جبر نہیں
ہزار حیف نہیں اختیار ہی دل پر

لگا دے تیر کے پر مجھ کو بیقراریٔ دل
کہ مثل تیر کے پل میں گزر جا کے اپنی منزل پر

ہے غبار کو جھٹکو نہ قافلے والو
کہ ٹھوکروں میں پہنچ جائیگا یہ منزل پر

کسی کو قبر میں بھی چین نہ پائیگا کوئی
کہ تین دن کے ہیں مہماں یہ پہلی منزل پر

کجا وہ جلوہ گہ ناز تو کجا اے نظم
یہ آرزو تجھے اس حوصلہ پہ اس دل پر

۷۵ ——— فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل ——— ۱۷

گو چہ کوئی نکلے جو رگ جاں کے قریں اور
اس گنبد بے در سے نکل جائیے کہیں اور

ہو سکتا ہی عالم میں جو ہو مہر جبیں اور
تجھ سا تو تصور میں بھی عالم کے نہیں اور

دل لیکے ستمگار ہوا پر سر کیں اور
دل جان تو ڈر ہو کہ وہ بگڑیگا کہیں اور

اللہ رے ساقی کا تجاہل ہو کے بلانا
کہتا ہوں کہ بس بس تو وہ کہتا ہی نہیں اور

زاہد ہو مرے اور تری سجدہ میں ہی فرق
شوق اور ہوس ہو دل اور ہی دیں اور

کوثر پہ بھی زعم پہ بھی گذرا ہی تو واعظ
دیکھے ہیں کہاں ہم سے خرابات نشیں اور

خط لیکے جو قاصد ترا آیا تو میں سمجھا
لائے ہیں صحیفہ کوئی جبریل امیں اور

لبریز جام عمر ہوا آ گئی اجل
لو اٹھ گئے بھرا ہوا پیمانہ چھوڑ کر

اس پیر زال دہر کی ہم ٹھوکروں میں تھا
جب سے گئی ہے ہمت مردانہ چھوڑ کر

پھرنا ہمارا آپ میں آنا محال ہے
کوسوں نکل گیا دل دیوانہ چھوڑ کر

اوڑا جو شیشہ طاق سے زاہد کا ہی چلا
کرتا ہے رقص سجدۂ شکرانہ چھوڑ کر

پیمودہ دریا تو نشانی ہے کفر کی
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ چھوڑ کر

زندان میکدہ بھی ہیں لیے خضر منتظر
بستی ہیں آئے کبھی ویرانہ چھوڑ کر

احسان سر پہ لغزش مستانہ کا ہوا
ہم دو قدم نہ جا سکے میخانہ چھوڑ کر

وادی بہت مہیب ہے بیم و امید کا
دیکھیں گے شیر پہ دل دیوانہ چھوڑ کر

رو رو کے کر رہی ہے صراحی وداع اب
جاتا ہے دور دور جو پیمانہ چھوڑ کر

توبہ تو کی ہے نظم بنا ہو گی کس طرح
کیونکر جیو گے مشرب رندانہ چھوڑ کر

١٥

بت کہتے ہیں کبھی کبھی تصویر دیکھ کر
سو جی ہی دل لگی مجھے دلگیر دیکھ کر

واللہ آئینہ سے بھی پردہ کیا کرو
ڈرتا ہوں میں نگاہ میں تاثیر دیکھ کر

پہلو سے دو گھڑی نہ سرکتے تھے جو کبھی
گھبرا رہے ہیں وہ فن تاخیر دیکھ کر

سایے کے ساتھ دھوپ بھی شرما کے ہٹ گئی
زلفوں میں روئے یار کی تنویر دیکھ کر

عالم سے مجھکو صانع عالم کی یاد ہے
معمار کا خیال ہے تعمیر دیکھ کر

سمجھے مری دعا کو ملک نردبان عرش
پیہم صعود نالۂ شبگیر دیکھ کر

دوزخ میں اے کریم میں کیونکر گلہ کروں
تعزیر دی تو لائق تعزیر دیکھ کر

نالہ کی اپنے بے اثری یاد آ گئی
تڑپا ہیں صید کو ہدف تیر دیکھ کر

گردوں پہ ہے حداثت سن کا یقین مجھے
پیہم یہ انقلاب یہ تغییر دیکھ کر

وہ ہیں غرور حسن سے ضحاک روزگار
شانوں پہ اپنے زلف گرہ گیر دیکھ کر

سفاک خلق تجھ کو خدا نے بنا دیا
اہل جہاں کو لائق تعزیر دیکھ کر

خالق عطا کرے مجھے دیوانگی عشق
آنکھیں بچھاؤں حلقۂ زنجیر دیکھ کر

جب دل الٹ چکا تو ہوئی ہیں وہ مہرباں
اب کڑھ رہی ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

پھر اگلا ہے ہاتھ مرا انکو کیا غرض
بازو سے کیوں لپٹ گئے شمشیر دیکھ کر

اے نظم تجھ فلک کے ستم کا گلہ نہیں
کرتے ہیں شکر خواہش تقدیر دیکھ کر

٧٨ ــــــ فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ــــــ ١٧

مجھ کو یارب تو عطا کر دل نالاں دو چار
دل ہوں دو چار تو ہر دم میں ہوں ارماں دو چار

اے جنوں مجھکو دکھا عالم امکاں دو چار
شش جہت کو میں سمجھتا ہوں بیاباں دو چار

گیسوؤں میں ہے شب وصل کا نقشہ باقی
کچھ گندھی رہ گئیں زلفیں تو پریشاں دو چار

میں ہوں وہ کشتۂ حسرت کہ لحد پر میری
اڑتے پھرتے ہیں حسینوں کے گریباں دو چار

شادی و غم کو یہ مانا کہ بہم ہیں لیکن
سیکڑوں دہر میں گریاں ہیں تو خنداں دو چار

نہ تو ہم ہنستے نہ کیا کچھ نہ کہا کچھ ہم نے
تہمتیں چند لگائی گئیں بہتان دو چار

سایۂ سرو میں بیٹھے ہیں کہ آزاد ہیں ہم
کاٹ دینگے اسی کمی میں ہیں زنداں دو چار

رات اندھیری تھی مگر سیکڑوں تارے ٹوٹے
آئی تھی خون کے آنسو سر مژگاں دو چار

ایک دو ان کی گرہ میں ہیں بہت سی خرمن
ایک غنچہ کی بغل میں ہیں گلستاں دو چار

لاکھ صدمے ہوں مگر عشق کا ایسا ہی مزا
کہ ہزاروں میں ہوئے ہونگے پشیماں دو چار

کیا ملا تجھکو صبا پھول کے غنچہ کی گرہ
نکلے دو چار جو دامن تو گریباں دو چار

اتنے فرقے ہوئے کس طرح مسلماں نکلے
یہ تو معلوم ہے اوترے نہیں قرآں دو چار

اپنے ساحل پہ جگہ دے ہمیں اے بحر کرم
تشنہ لب جھیل کے آئے ہیں بیاباں دو چار

پیکر خاک کجا اور کجا عقل و ہوس
اوترے ہیں منزل خاکی میں یہ مہماں دو چار

غم ہی کیوں زردی تو دیکھ تماشائے جہاں
رنگ بدلے گی ابھی گردش دوراں دو چار

کوچۂ تنگ میں ہیں سیکڑوں مضموں کی صفیں
میرے خامہ کو بھی چاہیے میداں دو چار

ان میں کچھ ہی اشعار میں حاصل اے نظم
آسماں بھر میں ستارے ہیں درخشاں دو چار

۶۹ ـــــــ ۲۶

رو دئے ناصح بے درد کے سمجھانے پر
ہنس دئے راز غم عشق کے کھل جانے پر

ناز کرتا ہے فلک ظلم و ستم ڈھانے پر
اور زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل جانے پر

تف ہے ای دور فلک اس تیرے پیمانہ پر
نہ تو یاروں پہ بھروسہ ہے نہ بیگانوں پر
مجھکو چھٹکے ہوئے تارے نہ دکھا ای گردوں
سعی سے باز نہ آ آب رواں کے مانند
حیف چھاتی پہ سلاطین کے ہے دہر اینٹھے
نہ تسلط ہے کسی کا نہ مزاحم کوئی
سلسلہ خواب پریشاں کا ہے بیداری بھی
نہ ملی موج حوادث سے ہمیں کو پناہ
حرص کیوں آئے یہاں تو ہے قناعت پہ گذر
کس طرح میں نہ تری دام میں آ الجھا
چونکو ہشیار ہوا سایہ میں تیغ نیلو
سو سخن شہر خموشاں میں لگے رہتے ہیں
سر کشو گور غریباں میں یہ کیا حال ہوا
کچھ نہ اندیشہ عقبیٰ ہے نہ فکر دنیا
اس زمانے میں نجانے تو کہاں تھا او خطا
کاسہ گر نے تو نہ پائی ہمیں جمشید کی جا
جانفشانی میں ادھر اندازہ پرافشا نہیں

رشک ہے خضر کو سقراط کے پیمانہ پر
دیکھے دھوکا نہ یگانہ کا ہو بیگانہ پر
طائر عرش ہوں گرتا نہیں میں دانہ پر
نقش تدبیر کا بن بن کے بگڑ جانے پر
خس کی ہستی نہ ہوئی قہر کے تہ خانے پر
سو خزانے ہوں تصدق کروں ویرانہ پر
ہوش آیا نہ ہمیں ہوش کے بھی آنے پر
تیغ پہ رکھی ہے جوشن پہ نہ دستانہ پر
کہہ دو تمہیں کا ہے پہچانا مری کاشانہ پر
کہ مرا نام تھا لکھا ہوا ہر دانہ پر
اب تو عبرت ہو تمہیں ہوش کے جھلجانے پر
ہمکو ہوتی نہیں عبرت کسی افسانے پر
سر اوٹھایا نہ کبھی پاؤں کے ٹھکرانے پر
رشک کس طرح نہ عاقل کو ہو دیوانہ پر
دل کو جب تاب نہ تھا قابو سے نکل جانے پر
نام لکھا ہے ترے لکھا ہے پیمانہ پر
رشک [illegible] پروانہ پر

رکھتے ہیں ابرو و عارض صفت تیغ و ترنج
لو چھری پھر گئی یوسف کے خریداروں پر

ہوس لذت بیداد نہ پوچھو مجھ سے
دل جب آتا ہے تو آتا ہے دل آزاروں پر

لطف یہ ہے ابھی کھینچی نہیں اس نے تلوار
ٹوٹ پڑتے ہیں گنہگار گنہگاروں پر

بلغ سحر قوس قزح کی نظر آتی ہے طناب
خیمہ زن ابر ہوا آکے جو کہساروں پر

ہو گیا سوکھ کے جھرمٹ میں جو خورشید غروب
سرخ ہے رنگ شفق پھولی ہے رخساروں پر

سختیاں عشق کی جب طے ہو چکیں جھیل کے
ہم نے دیکھی ہے تجلی انہیں کہساروں پر

بڑھ گئی کس کی سواری فلک ہفتم سے
رشک جبریل کو ہے غاشیہ برداروں پر

جب سے دیکھا تجھے انگشت شہادت کی طرح
انگلیاں اٹھتی ہیں یوسف کے خریداروں پر

میرے نالوں کو جو کوٹھے پہ نہ آنے دو گے
چاندنی شب [illegible] گا دیواروں پر

دل تڑپتا ہے یہ شاید کسی پروانہ کا
آج کوندا نظر آتا ہے جو کہساروں پر

لالہ پھولا تو یہاں آگ کسی سر کو نہ پھولی
بیخودی چھائی گھٹا دیکھ کے گلزاروں پر

سختیاں طالب دیدار اٹھاتے ہیں عبث
ٹھوکریں کھا چکے موسی انہیں کہساروں پر

نالے بے سود ہیں فریاد ہے بیکار اے نظم
رحم آئیگا نہ ظالم کو گرفتاروں پر

۱۲ — ۸۱

گر دو ٹوں [illegible] باہم لونگی شامل کیونکر
جذب دل کھینچ [illegible] لیلی کو باہم

اگندھ گیا ہار کی کلیوں میں مرا دل کیونکر
[illegible] آتی ہے محمل میں محمل کیونکر

گورے گالوں پہ ٹھہرتی ہے نظر مشکل سے
پا گئی راہِ فنا تو تو تڑپ کر اے برق
مجھ سے تو ضعف سے کروٹ نہیں لی جاتی
کسطرح باغ میں بلبل کا دل اڑا لیتا
ہمتِ پیرِ مغاں کی ہے کرامات یہ سب
تین دن تو ہی ظلمات میں کشتی ہلال
برق رفتار ہی کیا قافلۂ عمرِ رواں
دل کو رکھونگا میں اب باندھکے زنجیروں میں
موجِ دریا سے یہ عبرت کا فسانہ سن لو
کچھ غبارِ سرِ رہ کو یہ خبر ہے معلوم
کچھ خبر شمعِ فروزاں کو ہے پروانہ کی
دلِ پر درد تو شیشہ سے سوا ہے نازک
میں ہوں بیمارِ غم اور عمر کی منزل ہے پہاڑ
دورِ گردوں میں ہے بیقدریِ اسبابِ نزار

۸۴

میں یہ حیران ہوں کاجل کے بنے تل کیونکر
دیکھیں ملتا ہے کہیں جادۂ منزل کیونکر
ہوں یہ حیران تڑپتا ہے مرا دل کیونکر
اور سنی جائیگی فریادِ عنادل کیونکر
ابھی خالی تھی ابھی بھر گئی محفل کیونکر
آ گئی ڈوبتی تیرے لبِ ساحل کیونکر
ایک دم میں یہ گیا سیکڑوں منزل کیونکر
دیکھتا ہوں کہ تڑاتا ہے سلاسل کیونکر
کشتیاں ڈوب گئی ہیں لبِ ساحل کیونکر
قافلے لٹ گئے آ کر سرِ منزل کیونکر
ایک جلوہ میں یہ سب ہو گئے بسمل کیونکر
اب ہو صبر کی چھاتی پہ دھروں سل کیونکر
ناتوانی میں کروں قطعِ مراحل کیونکر
جائے حسرت ہے کہ جیتا ہے یہ کامل کیونکر

۱۴

دھوکا زلفوں نے دیا عنبرِ سارا بن کر
مرضِ عشق میں سو مرتبہ میں مر کے جیا

سحر آنکھوں نے کیا نرگسِ شہلا بن کر
لو چھپا لوں سے جو بیٹھے ہیں مسیحا بن کر

وہ نہیں ہیں تو زمانہ ہے نظر میں اندھیر
شمع منہ اپنا ہی دکھلا کے ہے روشن ہوکر

وصل سمجھوں کسے ہجر میں اے بندہ نواز
دور رہتے ہو قریب رگ گردن ہوکر

ہے غرور اہل جہاں سے کہ ملا ہے ہم کو
جادۂ منزل عرفاں رگ گردن ہوکر

نگہ ناز نے تاراج کیا خانۂ دل
چور بنکر کبھی لوٹا کبھی رہزن ہوکر

نامرادی کا میں خوگر تھا بر آئی جو مراد
شکر منہ سے مرے نکلا بھی تو شیون ہوکر

گردشیں چرخ کی سر پر نہ ہوئیں جب مجھے
آگئے قید ہوئی گریں حلقۂ آہن ہوکر

ماہ نو دیکھ کے اوس ترک کماں ابرو کو
مل گیا خاک میں نقش سم توسن ہوکر

سخت مشکل تھی پہنچ اوٹھ کے دیکھا حالت مری
نالے کرنے لگی زنجیر بھی آہن ہوکر

لکھنؤ گردش گردوں نے چھڑایا نظم
دور پھینکا مجھے آخر کو فلاخن ہوکر

۴۸ — ۱۶

سرو قد حشر اٹھا قامت دل جو ہوکر
فتنے بیدار ہوئے نرگس جادو ہوکر

شام ہی سے یہ شب عیش کا عالم دیکھا
کام آگئی طول شب گیسو ہوکر

صبح ہوائی شب عشرت تری صدقے جاؤں
ڈھانک لے چہرہ خورشید کو گیسو ہوکر

منتیں مان رہا ہے مری مرنے کی فلک
سر پہ آئی جو بلا رہ گئی گیسو ہوکر

لب پہ ہے مہر خموشی کی مگر آنکھوں سے
حسرت دید پلک پر ٹپکی ہے آنسو ہوکر

حسرتیں کم نکلیں مری لیکن نکلیں
کبھی آہیں کبھی نالے کبھی آنسو ہوکر

دل میں تھا صفا کی خود صید ہو جانیکا خوف | ٹوپیاں ونی چڑھا دیں دیدۂ نخچیر پر

پھیلے تو وہ گذرے جو کچھ کہے عزم بلند | بعد اسکے کر بھروسا خواہش تقدیر پر

اپنے خرمن پر تسلط دیکھتے ہیں غیر کا | ہے بھروسا ہم کو برق نالۂ شبگیر پر

خوف رسوائی سے اٹھتی ہے صدا جھنکار کی | گر کسی کی آنکھ پڑتی ہے مری زنجیر پر

خاک کی چٹکی ہے کافی خاکساروں کیلئے | کیا دوا ہر درد کی موقوف ہے اکسیر پر

کہنے سننے کا اثر اغیار پر ہوتا نہیں | آ رہا اہل وفا کا فیصلہ شمشیر پر

جانتا ہوں میں کجا خاک درِ جاناں کجا

نظم مجھ کو ناز ہے اس خوبی تقدیر پر

٨٦ — مفاعلن فاعلن فعولن دو بار — ١٨

ہنسی میں وہ بات میں نے کہدی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر

چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرہ کا رنگ ہو کر

ہمیشہ کوچ و مقام اپنا رہا ہے خضر رہ طریقت

رکا تو میں سنگ میل بنکر چلا تو آوازہ زنگ ہو کر

نہ توڑتے ارسے اگر تم تو اتنے یوسف نظر نہ آتے

یہ قافلہ کھینچ لائی سارا شکست آئینہ زنگ ہو کر

شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پردہ ہی فسانہ

یہ رنگینی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

کبھی زن پیر زال بنکر کبھی بت شوخ و شنگ ہو کر
او شوخ تجھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر بال نہ چاہیے تھا
کہ رہ گئی میری دل کی حسرت شہید تیغ و رنگ ہو کر
جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجوم لیت و لعل ہیں حیا رے
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں رہے دریغ و دنگ ہو کے

۱۳ — مفاعیلن ۴ بار — ۸۷

جنوں کے ولولے جب گھٹ گئے دل میں نہاں ہو کر
تو اٹھے ہیں ہوا ہو کر گرے ہیں بجلیاں ہو کر
کچھ آگے بڑھ چلا سامان راحت لامکاں ہو کر
فلک پیچھے رہا جاتا ہے گرد کارواں ہو کر
کسی دن تو چلے اے آسماں باد مراد ایسی
کہ اتریں کشتی میں پھٹا ہیں بادباں ہو کر
نہ جانے کس بیاباں مرگ نے ہستی نہیں پائی
بگولے جا رہے ہیں کارواں در کارواں ہو کر
وفور ضبط سے بیتابی دل بڑھ نہیں سکتی
گلے تک آ کے رہ جاتے ہیں نالے ہچکیاں ہو کر
الگو گیر اب تو ایسا انقلاب رنگ عالم ہے

کہ نغمے نکلے منقارِ عنادل سے فغاں ہو کر

جو ہو کر ابر سے پابوس[1] خود پہنچے کبھی دہقاں

جلادیں کھیت کو پانی کی لہریں بجلیاں ہو کر

جہاں میں واشدِ خاطر کے ساماں ہو گئے لاشے

جگر راحت کی نا ممکن ہوئی ہے امکاں ہو کر

ہنسے کوئی نہ بجلی کے سوا اس ابرِ ماتم میں

اگر یہ جائے سارا کھیت کشتِ زعفراں ہو کر

الم میں آشیاں کے اس قدر تنکے چنے میں نے

کہ آخر باعثِ تسکیں ہوئے ہیں آشیاں ہو کر

گھٹائیں گھر کے کیا کیا حسرتِ فرہاد پر روئیں

چمن تک آ گئیں نہریں پہاڑوں سے رواں ہو کر

دلِ شیدا نے پایا عشق میں معراج کا رتبہ

یہاں اکثر بتوں کے ظلم ٹوٹے آسماں ہو کر

جو ڈرتے ڈرتے دل سے ایک حرفِ شوق نکلا تھا

---

[1] پابوس فارسی والوں کا تراشا ہوا لفظ ہے اور صفات عربی ہے علاوہ عالم ... صحیح ہے اور اب اردو میں بھی مستقل ہو گیا ہے۔ اسے فارسی میں نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ منحوس بھی ملبوس کے قیاس پر فارسی والوں کا تراشا ہوا ہے ۔۔ ۱۲

وہ اس کے سامنے آیا زباں پروانساں ہوکر
نکل آتے ہیں ہر اقرار میں انکار کے پہلو
بتا دیتی ہیں حیراں تیری باتیں مکریاں ہوکر
نزاکت کا یہ عالم پھول بھی ٹوٹے تو بل کھا کر
نہ جانے دل میرا کس طرح ٹوٹا پہلواں ہوکر
نذر و دکیک ہیں کر اوٹھو، اوٹھا لئے میں
سبک کرتے ہیں ان کو اتنے بار گراں ہوکر
گلا گھونٹا ہی ضبط غم نے کچھ ایسا کہ مشکل ہے
کہ نکلے منہ سے آواز شکست دل فغاں ہوکر
نتیجہ اندیشہ سالک نے پایا منزل دل کا
تو پلٹا لامکاں سے آسماں در آسماں ہوکر
ہوئی پھر دیکھئیے آبستن شادی و غم دنیا
ابھی پیدا ہوئے تھے رنج و راحت توامان ہوکر
جو نکلی ہو گی کوئی آرزو تو یہ بھی نکلے گا
تمہارا تیر حسرت بن گیا دل میں نہاں ہوکر
اوترجائیگا تو او افتاب حسن کوٹھے سے
گریگا سایۂ دیوار ہم پر آسماں ہو کر

۷ — ولہ — ۸۸

وہی سمجھیں گے اس کو جو نظر رکھتے ہیں جوہر پر
کہ اب تک ہنس رہا ہے آئینہ بخت سکندر پر

خبر دیتا ہے بیتابی کی اشک خوں سر مژگاں
لہو کی بوند دیکھو اور کروٹ نوک نشتر پر

مے عرفاں کہ جھوٹی کی ہوئی ہو میرے ساقی کی
ٹپکتی ہے مری رال اُس شراب روح پرور پر

بنائی جان ایسی سخت اور دل اسقدر نازک
زہی قدرت تری پھینکا ہے کیا شیشہ کو پتھر پر

بڑھایا کیا سمجھ کر اور اس پر بار عصیاں بھی
ازل کے دن سے کچھ بار امانت کم نہ تھا سر پر

کہیں ایسا نہو نالوں سے میرے حشر ہو جائے
مرا انصاف یارب تو نے کیوں رکھا ہے محشر پر

جو اشک آنکھوں میں بھر لائے ہو آئینہ دکھا دونگیں
ڈھلکنا دیکھ لو شبنم کا رخسار گل تر پر

۸ — فاعلاتن مفاعلن فعلات — ۸۹

آگرکے اٹھا ہوں ہیں ہر اک جا پر	آفریں شوق گام فرسا پر

باندھی ہے مدح شہ کی دھن میں نے
دے خدا گر دل و زباں تو کرے
جزر و مد میں فنا کے ہے عالم
آسماں پھینکتا ہے سنگِ جفا
رقص اس گنبدِ زبرجد کا
کچھ سلیمان سے بھی زیادہ ہے

نغمۂ عندلیب شیدا پر
شکر راحت پہ صبر ایذا پر
بہہ رہا ہے یہ قصہ دریا پر
ق
تاک کر قلب ناشکیبا پر
ہے صدائے شکست مینا پر
نازِ منعم کو نقش دیبا پر

خطبہ پڑھتا ہے پیرزن کا غبار
عدل کسریٰ کا طاقِ کسریٰ پر

حرف ش

۹۰ —— ۱۴

خارِ حسرت کو ہے جگر کی تلاش
عشق میں تیرے ہے جہاں بیمار
اپنے دل میں خدا کو ڈھونڈھ لیا
میں دعا مانگتا ہوں محشر کی
میکدہ کو ہمارے ڈھونڈھ لیا
سرمۂ خوش چشم کو ہے مد نظر
جو رہ عشق میں ہیں وارفتہ

گل داغ جنوں کو سر کی تلاش
چارہ گر کو ہے چارہ گر کی تلاش
حد سے اب بڑھ گئی بشر کی تلاش
ہے جو اک شوخ فتنہ گر کی تلاش
گئی خالی نہ ابر تر کی تلاش
فتنہ گر کو ہے فتنہ گر کی تلاش
نہیں رکھتے وہ راہبر کی تلاش

ایڑیوں تک پہنچ کے ٹھہری زلف — مصرع قد ہے رات بھر کی تلاش

دوپہر تک تھا انتظار اوس کا — دوپہر تک رہی سحر کی تلاش

مجھ کو سکتا ہوا جو ہجر کی شب — رہی آئینہ سحر کی تلاش

غرق رہتا ہوں فکر مضمون میں — ڈوب کر چاہیے گہر کی تلاش

یا الٰہی ہو ایسا جوش بہار — رگ گل کو ہو نیشتر کی تلاش

دل جو ٹوٹا تو پھر نہیں جڑتا — کیجیے خاک شیشہ گر کی تلاش

مل گئی قبر کی جگہ اے نظم
ہو گئی ختم عمر بھر کی تلاش

۹۱ — مدح اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہٗ — ۱۰

شب قدر ست زلف عنبر بیزش — طلوع صبح عید است از جبینش

شہ با دل کہ حق یادش نگہبان — بہ تاج و تخت و ملک و داد و دینش

چناں آراست ملکش در زمانش — کہ مثل آسمان شد سر زمینش

معظم جاہ شد ماہ تمامش — چو اعظم جاہ شد مہر مبینش

رواں کردست دریا در بیاباں — کہ باشد بحر عمان در کمینش

فلک نیلی ز عکس آبگونش — زمیں سرسبز از ماء معینش

نہ ہے ایں چشمہ سار صاف شیریں — عیاں راز دل از چین جبینش

چناں کشت و چمن را کرد شاداب — کہ عذرا بر فلک شد خوشہ چینش

کنار رود موسی داو ریگاه | که موسی خاتم است و اونگینش
زہے شاہیکہ در قالب شد روح | صریر کلک معنی آفرینش

۹۲ ولہ ۱۳

طلسمے بیش بنود لجہ ہستی و سیلا بش
کہ بر ہم میزند موج فنا صد نقش بر آبش
زند صد قافلہ پے ہم کند صد سلسلہ بر ہم
گہ از ابروئے پُر چینش گہ از گیسوی پر تابش
دوائے درد دل باشد لب آں عیسی دوراں
کہ دارد طعم صد تنگ شکر اندر دو عنابش
چو اکسیر وفا خواہی شرار عشق روشن کن
دل مضطر بدست آور کہ بنیاجیست سیمابش
رگ نخوت ہمی باشد طناب گردن ظالم
کہ بر خاک مذلت میکشد از فرش سنجابش
بہ زخم ابروے او لذت آزار دہ چنداست
کہ بوئے شکر می آید ازیں تیغ سیہ تابش
اگر سر می نہم بر پائے نازک سرگراں گردد
دگر سر می کنم افسانہ غم می برد خوابش

سپہر و انقلاب بے ہم او نیست بے چیزے
کہ خون عالمے چوں آب خواہد ریخت و ناش

بگورستاں سر فغفور می بینم سر خشتے
کجا شد بالش قاقم کہ بد نازش گہ خوابش

اگر برخاست روزے گرد باد از آہ مظلوماں
شکست او تا دایں نہ خرگہ نیلی و اسبابش

و زیں جوش سرشک از ماجرائے دل چہ می پرسی
کہ سر بر زد حباب آسا ز بحر و بر دو سیلابش

عزیزے کو کہ از اسرار ہستی پردہ برگیرد
دل خلقے بجاں آمد ز یک تعبیر و صد خوابش

نباشد صورتے فارغ ز معنی اندریں عالم
چو آئینہ قدم زن در رہ دیدار معنی یابش

حرف ض

۹۳ — ۱۰

کچھ ابر نے اوڑتی ہوئی دی ہے خبر فیض
کانٹوں پہ ہی دو رہ لو آنکھوں پہ ہے ہر ر...

آتا نہیں دریا کی روانی میں کبھی فرق

ساقی نظر فیض ہو ساقی نظر فیض
اک وادی اسراف ہی اک رہ گذر فیض

ہے تہمتیں رکتی نہیں شو یہ سر فیض

کہتے ہیں جسے چشم طلب وہ تو ہو پیدا — اک جنبش مژگاں سے ہمیں لاکھ درِ فیض

طوبیٰ لکم اے اہل کرم واہ ری رفعت — لے اڑتے ہیں طوبیٰ کی طرف بال و پرِ فیض

اے پیر مغاں دست نگر تیرے ہیں میکش — ہاتوں کی لکیریں ہیں کہ ہیں رہگذرِ فیض

کیا اہل قناعت کو غرض اہل غنی سے — ہم کو سرِ فیض اب نہ ہوا ہیں نہ درِ فیض

زاہد تجھے کیا اس کی کریمی سے عجب ہے — توبہ کا ہو در بند تو کھل جائے درِ فیض

گر حباب حوادث میں ہوں اے سید فیاض — اتر جاؤں میں ہو جائے جو تجھ پہ نظرِ فیض

مانند نگیں آنکھ جھپک جائیگی اے نظم
اٹھ جائیں گے ہم چھوڑ کے اپنا اثرِ فیض

حرف (ف)

۹۴ — ۱۶

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ زن کی طرف — چلا ہے چھوڑ کے بسمل مجھے ہرن کی طرف

بنا ہوا ہے کہ آئینہ آپ سے یہ خانہ[1] — نہ دیکھی راہ جو خلوت سے انجمن کی طرف

رہِ وفا کو نہ چھوڑا وہ عندلیب ہوں میں — پھٹا قفس سے تو پرواز کی چمن کی طرف

گریز چاہیے طول امل سے سالک کو — سنا ہے راہ پہ جاتی ہے راہزن کی طرف

سرائے دہر میں سوؤ گے غافلو کب تک — اٹھو تو کیا تمہیں جانا نہیں وطن کی طرف

بھلا دل میں یہ لگ ہیں وہ اہل ظاہر سے — نہ ہیں ہوس شیخ کی جانب نہ برہمن کی طرف

[1] آئینہ کے ہر ٹکڑے میں پورا عکس دکھائی دیتا ہے ہر ہر ٹکڑا آئینہ بن جاتا ہے ۱۲

جہاں حادثہ آگیں میں شہ کا ورود
گذر حباب کا دریا سے موجزن کی طرف

اسی امید پہ ہم دن خزاں کے کاٹتے ہیں
کبھی تو باد بہار آئیگی چمن کی طرف

بچھڑ کے تجھ سے مجھے ہے امید ملنے کی
سنا ہے روح کو آنا ہے پھر بدن کی طرف

گواہ کون ہے قتل کا ہو محشر میں
ابھی سے سارا زمانہ ہے تیغ زن کی طرف

خبر وہی اٹھے کے قیامت نے اسکو آنے کی
خدا ہی خیر کرے رخ ہے انجمن کی طرف

وہ اپنے رخ کی صباحت کو آپ دیکھتے ہیں
جھکے ہوئی گل نرگس ہیں یاسمن کی طرف

تمام بزم ہی کیا محو اوس کی باتوں میں
نظر دہن کی طرف کان ہے سخن کی طرف

اسیر ہو گیا دل گیسوؤں میں خوب ہوا
چلا تھا ڈوبکے مرنے چہ ذقن کی طرف

یہ مسکینوں کی ادا اثر بھی سیکھ گئے
اکتار جو سے جو لٹے چلے چمن کی طرف

زہے نصیب جو ہو کربلا کی موت اے نظم
کہ اوٹھ کے خاک شفا آئے خود کفن کی طرف

(۸) —— ۹۵

ہوں میں بید جاگا وحشت میں بیاباں کی طرف
ہاتھ جس طرح سے آتا ہے گریباں کی طرف

تھے بیٹھے دل غمگیں کو یہ کیا لہری
اوٹھ کے طوفان چلا دیدۂ گریاں کی طرف

دیکھنا لالۂ خود رو کا لہکنا ساقی
کوہ سے دوڑ گئی آگ بیاباں کی طرف

رو دیا دیکھ کے اکثر میں بہار شبنم
ہنس دیا دیکھ کے اکثر گل خنداں کی طرف

بات چھپتی نہیں بیٹھی ہے نگاہیں سب کی
اوس کے دامن کی طرف ہے [illegible] کی طرف

سیکڑوں داغ گنہ دھو گئے رحمت تیری | کیا گھٹا جھوم کر آئی تھی گلستاں کی طرف

چشم آئینہ پریشاں نظری سیکھ گئی | دیکھتا تھا یہ بت زلف پریشاں کی طرف

سر جھکائے ہوئے ہے نظم بیاں خامہ
سمت سجدے کی ہے تیرے خط قرآں کی طرف

۹۶ —— حرف ق —— ۱۲

خاک جاں پر ہو مبتلائے فراق | لے چلی قبر میں بلائے فراق

ہے فلاطون عشق کا ارشاد | شربت مرگ ہے دوائے فراق

نہ بنا ہو طرز نازش وصل | منہ پھراتا ہے اک ادائے فراق

شب فرقت ابھی سحر ہو گی | لب تک آئیں تو نالہائے فراق

تھے مزے عشق کے جوانی تک | ہائے لطف وصال ہائے فراق

وصل کی تو دعا قبول نہیں | مانگنا چاہیے دعائے فراق

ہو گئی صبح رہ گیا قصہ | تھے ابھی لب پہ شکوہ ہائے فراق

تا فلک پہنچی تا اثر نہ گئی | واہ ری آہ نا رسائے فراق

چشم پر خوں کا جام پر ہے یقیں | گریہ سمجھا میں خندہ ہائے فراق

گرشتہ سیماب اضطراب کا ہے | دل کو حاصل ہے کیمیائے فراق

ساغر بادہ سے ہے دل پر خوں | شور فریاد سے ہے صدائے فراق

عدم سے دہر میں برزخ سے آئی محشر میں
رکا نہ پاؤں نہ بیٹھے کہیں قرار سے ہم

خبر یہ صور میں تھی ہر کریم کا دربار
یہ شور سن کے نکل آئے ہیں مزار سے ہم

قطعہ

نہ سمجھے یہ کہ نمائش سراب کی ہے جہاں
غضب میں پڑ گئے ہستی کے اعتبار سے ہم

غضب کا رقص فلک نے ہمیں دیا ہو گا
رہے نہ آپ میں اک جلوۂ شرار سے ہم

ہزار معرکۂ امتحان ہوئے اے نظم
کسی سے کم نہ رہے فضلِ کردگار سے ہم

۱۲ ——— ۹۰

جاں در ہوائے بادۂ اطہر فروختیم
دل در بہائے ساغر کوثر فروختیم

در کار سالکاں زر و زیور فروختیم
وز بہر حفظ نام و نسب سر فروختیم

تا دل بہ آں دو زلفِ معنبر فروختیم
خود را فروختیم و مکرر فروختیم

جاں را برائے آبروئے خود فشاندہ ایم
سر را پئے گرفتنِ افسر فروختیم

درماندہ ایم زیر فلک چوں ہلال و بدر
تا تیغ آوریم بکف سر فروختیم

تا جا گرفت در دل ما خوف باز پرس
از رنگ روئے خود ورقِ زر فروختیم

تر کردہ جبے وی جز اشکِ ندامت بہانہ دا
آئینہ خانہ را بدو گوہر فروختیم

در شعر بس بخون جگر پا فشردہ ایم
تا مشک نافہ ہیچو گل تر فروختیم

رفتی غبار طبع بہ شیریں تبسمی
شادیم ما کہ خاک بہ شکر فروختیم

افتاد تا معاملہ با رحمت خدا | نامہ سیاہ بہ محشر فروختیم
روداد فاقہ مستی ما پیکشاں مپرس | دستار را بہ شیشہ و ساغر فروختیم
وارفتگی ما بخرام کسے مپرس | خود را بدست فتنہ محشر فروختیم

ولہ

۹۹ —— مفتعلن فاعلات ـ مفتعلن فا —— ۱۱

ہمتے از باد صبح گاہ گرفتم | رفتم و از غنچہ درس آہ گرفتم
عزم شبی خوں ترا مبارک و فرخ | فال ز بشکستن کلاہ گرفتم
دل بغم تو نداشت تاب صبوری | اشک سراسیمہ راگواہ گرفتم
منفعلم از وفا بعرصہ محشر | دامن یوسف باشتباہ گرفتم
مستی من از شراب گردش چشمیست | بادہ بہ پیمانہ نگاہ گرفتم
خار غم از بسکہ داشت تشنہ لبیہا | خون دل از نبض برگ آہ گرفتم
باطن من شد ز شرم ظاہر من آب | نکتہ چو برآب زیرکاہ گرفتم
از قدمم گرد باد تا رگ ابر است | من ز بیاباں سراغ جاہ گرفتم
خاک بچشمم فشاند و قافلہ بگذشت | سر مہ عبرت ز گرد راہ گرفتم
قفس ستمگار را بکشم و آنگہ | دست و گریباں عذر خواہ گرفتم

شعر اسیر است نظم شمع رہ ما
آتش از آں گرمی نگاہ گرفتم

حرف ن

۱۰۰ ——— مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ——— ۲۰

غمزہ بیاں میں نہیں اب اثر فغاں میں نہیں
بہار میں جو طبیعت تھی وہ خزاں میں نہیں

جو چل بسے کہیں انکا پتہ جہاں میں نہیں
نشان نقش قدم خاکِ رفتگاں میں نہیں

خوشی خوشی شب عشرت کسی میں کٹتا ہوں
کہ ایسی رات کوئی عمر جاوداں میں نہیں

یہ دیکھنا گل و بلبل کی کیا بن آئی ہے
اب اتفاق جو صیاد و باغباں میں نہیں

مجھی پہ حوصلے نکلیں گے آج قاتل کے
مرے سوا کوئی میدانِ امتحاں میں نہیں

چلی نہ چشم فسوں گر سے کچھ فسوں سازی
وہ سحر کونسا ہے جو مری بیاں میں نہیں

وہ سو کے اٹھے ہیں کسکو مجال عرض نیاز
مزاج پوچھئے یہ جرأت عزاجلانمیں نہیں

پھپھولے ڈالدیے ہیں میرے دل میں انکی ناصح
مجھے عجب ہے کہ چھالا تری زباں میں نہیں

وہاں خمار تغافل سے سرگرانی ہے
یہاں شراب اثر شیشۂ فغاں میں نہیں

دیا مجھے تری نیم نگہوں نے اک غم عشق
وہ داغ جو پڑا دل میں آسماں میں نہیں

مزا لہو شب غم نے پیا تو حسین آیا
کہ آج صورت خمیازہ کہکشاں میں نہیں

کشش جو دل میں ہے میری سر رشتۂ آہ میں ہے
وہ کہربا میں نہیں ہے یہ کہکشاں میں نہیں

فلک کو رشک ہوا اس کے طرز دامن پہ
ستارے ایسے یہ تحریر کہکشاں میں نہیں

جگر میں عشق کا ہے داغ رخ پہ اسکی چمک
فروغ ماہ نہاں پردۂ کتاں میں نہیں

یہ ہاتھ دوڑ رہا ہے عبث گریباں پر
کہ تار تار یہ ہے کچھ ستار بھی تو نہیں

اگر یہ حشر میں مجھ سے حساب کیا ہوگا
کہ بے حساب گنہ ہیں شمار بھی تو نہیں

کہا کہ درد جگر پھر کہو میں کہتا ہوں
ستم یہ ہے کہ تمہیں اعتبار بھی تو نہیں

کسی گڑھے میں گرا دے نہ تجھکو توسن عمر
وہ تیز گام ہے تو شہسوار بھی تو نہیں

اوڑانے آئی تجھے ہم خاک کوئی قائل ہیں
بدن پہ سر نہیں سر پہ غبار بھی تو نہیں

یہ سچ ہے نظم ہے دیوانگی میں رسوائی
جہاں میں ایسا کوئی پردہ دار بھی تو نہیں

۲۵ —————— ۱۰۲

تو ایک آہ میں اے چرخ کج مدار نہیں
جو خاک میں نہ ملا دوں تو خاکسار نہیں

کسی سے سیکھ امید کشود کار نہیں
مجھے اجل کے بھی آنیکا اعتبار نہیں

تجھکوں جو اہل تجر سے خاکسار نہیں
فلک سے دب کے رہی جو وہ یہ غبار نہیں

فقیر خانہ میں اہل ہوس کو بار نہیں
کہ شمع بھی مری محفل میں تاجدار نہیں

پھر اور کیا ہے یہ عالم جو رہگذار نہیں
کہ ہستی گذراں کا کچھ اعتبار نہیں

ہستی کے گزران ہونے سے معلوم ہوا ہے کہ عالم رہگذار ہے

نہ آن بان طبیعت میں ہو تو انساں کیا
کہ جس میں بل نہ ہو رسی وہ استوار نہیں

سنبھالے کون کسے کون لے کسی کی خبر
تمام بزم میں کوئی بھی ہوشیار نہیں

یہ تجھ سے زیست کا نقشہ بگڑ کے کہتا ہے
مزاج یار ہوں کچھ میرا اعتبار نہیں

کسی کے خون کا پیاسا ضرور ہے صیاد
کماں میں تیر ہے تیرے فتراک میں شکار نہیں

جواب نامہ کا قاصد مزار پر لایا
کہ جاتا تھا اسے تاب انتظار نہیں

یہ کہہ کے اٹھ گئی بالیں سے میری شمع سحر
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

زمین سخت فلک دور ہے بشر مجبور
فرو ہے جان بھی دینے پہ اختیار نہیں

قریب تر رگ گردن سے ہے پہ پھر بھی اتنا دور
نظر کے سامنے وہ پھر بھی آشکار نہیں

کسی کے جلوہ کو اس مشت خس سے کیا نسبت
وہ صاعقہ نہیں شعلہ نہیں شرار نہیں

جو وہ ہو پاس تو حور و قصور سب کچھ ہو
جو وہ نہیں تو نہیں بلکہ یہ بہار نہیں

چلے جو خاک شہیداں پہ اس گلی کی ہوا
چراغ لیکے بھی ڈھونڈو تو پھر مزار نہیں

کھڑے ہیں دام بچھائے ادھر ادھر صیاد
نہ کھا فریب یہاں نخل سایہ دار نہیں

گذرتے ہیں نفس مستعار مثل نسیم
کسی کو خار نہیں ہیں کسی پہ بار نہیں

عدم کا قافلہ کیا جانے کس طرف کو گیا
ذرہ بھی گرد نہیں راہ میں غبار نہیں

اوسی سے کہہ تیری کہنی پہ جو چلے ناصح
میں ہرزہ گرد نہیں ہوں نہیں ہرزہ کار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

فلک ہے وہ ستم کینہ ور خدا کی پناہ
عقال پاؤں میں جسکے نہیں مہار نہیں

ملیگی چشمہ حیواں کی تہ میں عظم رمیم
کوئی زمیں نہیں ایسی جہاں مزار نہیں

مقرر ہے دل میں تو دشمن زباں سے گو ہے کبھی
جو جوش کھا کے نکل جائے کیا بخار نہیں

غزل کہی ہے کہ موتی پروئے ہیں اے نظم
وہ کون شعر ہے جو در شاہوار نہیں

نہ اہلِ دل سے نہ اہلِ نظر سے پوچھتا ہوں
خبر وہاں کی ہر اک بے خبر سے پوچھتا ہوں

وفورِ شوق میں کھویا گیا ہوں میں ایسا
کہ نامہ لکھ کے پتہ نامہ بر سے پوچھتا ہوں

بتا یہ خواب کا عالم ہے یا ہے بیداری
یہ اپنی چشمِ حقیقت نگر سے پوچھتا ہوں

کوئی خبر نہیں دیتا ہے خاکِ جسم کی مجھے
میں خشت در سے کبھی کوزہ گر سے پوچھتا ہوں

میں وہ ہوں گردِ پسِ کارواں تھا کہ دم
کہ رہروؤں کا نشاں رہ گزر سے پوچھتا ہوں

اسی طرح مری آغوش سے اٹھا تھا کوئی
تڑپ تڑپ کے یہ دردِ جگر سے پوچھتا ہوں

عبث ہی خضر اگر ساتھ ہو لئے میرے
کہیں میں اس کا پتہ راہبر سے پوچھتا ہوں

کرشمہ اس کی نگہ کے کسی سے کیوں پوچھوں
یہ اپنے دل سے یہ اپنے جگر سے پوچھتا ہوں

ملا نہ نقشِ قدم ہی تو رہروؤں کا پتہ
میں اب غبارِ سرِ رہ گزر سے پوچھتا ہوں

بھرا ہے جامِ صبوحی کا شاخِ گل کی طرح
پتہ چمن کا نسیمِ سحر سے پوچھتا ہوں

شجر ہیں وہ جدھر دیکھوں گل ہیں کہ لئے نمود
یہ حالِ بلبلِ شوریدہ سر سے پوچھتا ہوں

ہنوز حقیقت کا ذوق باقی ہے
جواب کچھ نہ ملا عمر بھر سے پوچھتا ہوں

جگر تھا میرا ابھی کیا نہ وہ کب ستم کے لئے
میں آج قاتلِ بیداد گر سے پوچھتا ہوں

بتا تو عشق کا انجام ہوگا کیا اے نظم
مآلِ کار کو میں نیشتر سے پوچھتا ہوں

جو دل کو پیس کے پھینکیں تو آرزو نہ کریں
جو پاؤں کاٹ کے بیٹھیں تو جستجو نہ کریں

وہ جا کے باغ میں غنچہ کا دل لہو نہ کریں
شہید سرو چمن کو کنار جو نہ کریں

نکالیں تیغ کہ یک سو ہو روز کا جھگڑا
رقیب مجھ سے لگی لپٹی گفتگو نہ کریں

وہ اشک کیسے پھپھولے نہ جن سے پڑ جائیں
وہ داغ کیسے کلیجہ کو جو لہو نہ کریں

کہیں ہزار میں حق ہم وہ تیغ عریاں ہیں
کسی کا منہ نہ کریں پاس آبرو نہ کریں

جناب شیخ کے زہد و ورع کو دیکھ لیا
کٹیں یہ ہاتھ جو اب بیعت سبو نہ کریں

گلہ نہ شکوہ کہ وہ لب سے لب ملائے ہیں
دہن پہ مہر یہ کی ہے کہ گفتگو نہ کریں

قسم یہ دیجے میں کہتا ہوں آرزوؤں سے
مرا لہو پیئیں دل اگر لہو نہ کریں

حریف نکلے نہ چھریاں لگائیں بس مجھکو
شراب حلق سے اترے ہوئی لہو نہ کریں

وہی ہے سامنے مڑ کر جدھر جدھر دیکھو
وفور شوق میں کیوں سجدہ چار سو نہ کریں

مرا غبار یہ اٹھ اٹھ کے کہتا ہے سر راہ
کہ پاؤں چلتے ہوں اور تیری جستجو نہ کریں

گناہ گار کو آتی ہے منہ دکھاتے شرم
ہماری لاش کو احباب قبلہ رو نہ کریں

وہ پاک عاشق شوریدہ سر ہوئے کہ کبھی
حسین جہاں کے مراد کر بے وضو نہ کریں

جو دل پہ رکھیں تو رکھیں نہ دل میں کوئی ہوس
جو دل کریں تو کسی شے کی آرزو نہ کریں

جہاں کو رہ گذر عاریت اگر سمجھیں
مقام پھر کوئی دم مثل آب جو نہ کریں

ملا ہی یہ گل صد برگ سے سبق ہم کو
ہزار بھی ہوں زبانیں تو گفتگو نہ کریں

نماز میں نہ ہمیں قتل نفس ہو منظور
تو آستین الٹ کر کبھی وضو نہ کریں

نکل گیا کسی صحرا میں نظم آخر کار
جو یوں گیا اسی جانے دیں جستجو نہ کریں

۱۰۵ —— فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات —— ۲۰

چھٹکی ہی چاندنی سی دل پاکباز میں
ہے داغ سجدہ چاند جبین نیاز میں

آئی تھی بوئے ناز جو عرض نیاز میں
خاموش مثل شمع ہوں سوز و گداز میں

کچھ مجھ کو یہ خیال بھی ہی مشق ناز میں
پامال ہوگیا کوئی اس ترک تاز میں

جو شوخیاں ہیں خامہ افسوں طراز میں
وہ خوبیاں نہیں ہیں بتان طراز میں

ڈھیلے پڑے ہیں بند قبا خواب ناز میں
نقد وصال ہی گرہ نیم باز میں

نیچی نظر ہی شرم کی اونچی ہے قہر کی
بچتا نہیں شکار نشیب و فراز میں

دل لیکے بھول جانیکی عادت ہے آپ کو
اب کے گرہ لگائے زلف دراز میں

دل میرا اس طرف ہی اُدھر دل رقیب کا
دونوں کو تولیے نظر امتیاز میں

بے پردہ ہو گیا ہی تجلی سی حسن یار
ہے طاقت نگاہ کسی دیدہ باز میں

تیری زباں سی آگ لگی شمع انجمن
میری زباں کو دخل نہیں میرے راز میں

تقدیر کے لکھے کو نہ ہرگز بُرا سمجھ
لغزش محال ہے قلم کارساز میں

پردہ میں نغمہ زن ہے تو وہ ہوکا ہی رہ گیا
ہے جسم میں یہ روح کہ آہنگ ساز میں

کہتی تھی آج شمع سحر مجھ کو دیکھ کر
جیتے ہو کس طرح سے غم جانگداز میں

پھانسی لگا رہی ہی اجل کیا بُری طرح
الجھا کے رشتہ ہائے امید دراز میں

ہوں میں تو ناتواں مجھے کیونکر نہ خوف ہو
پھنستے ہیں شیر دام گہ حرص و آز میں

خالی نہیں فریب سے عیش اس جہاں کا
ساغر شراب کا ہے کف شیشہ باز میں

اس بحر پر خطر میں ہے تمیز جس کی موج سے
ڈر کر ہوا سوار تلاطم جہاز میں

وہ صید پر شکستہ ہوں پائی ہے پرورش
میں نے ہوائے بال و پر شاہباز میں

تسبیح اوسکے بعد پڑھی بھی تو کیا حصول
سو مرتبہ خدا کو جو بھولا نماز میں

تھا طاعت خدا میں بھی یہ حال اعظم کا
تصویر ایک کی رہی جا نماز میں

۱۰۶ ———— ۱۵

سر مو قضا سے عشوہ سحر آفریں نہیں
جادو کی ہے یوں نگہ شرمگیں نہیں

وہ دن ہے کونسا کہ میں اندوہگیں نہیں
ہر دل تو سب کے پاس یہ آفت کہیں نہیں

رکھتے کہیں ہو پاؤں تو پڑتا کہیں پہ ہے
سنبھلو زمیں ہے فلک ہفتمیں نہیں

چرخ کیطرح رنگ بدلتا ہے آسماں
کیونکر کہوں کہ نالہ دل آتشیں نہیں

اوس تنگدل پہ ہاتھ خزانہ کا سانپ ہے
افعی کی کینچلی ہے تیری آستیں نہیں

سر میں بھرا ہوا ہے تیری بادہ غرور
موج شراب ناز ہے چین جبیں نہیں

سر سبز کر دیا ہے سخن گو غزال کو
کم سامری سے غمزہ سحر آفریں نہیں

پینے میں خون دل کے حلاوت کچھ ایسی ہے
حیراں ہوں شکر نہیں انگبیں نہیں

جنت میں لطف کوچہ دلدار کا سہی
لیکن وہاں مزار کے قابل زمیں نہیں

کہتا ہے حال قبر کا دوزخ کا خلد کا
واعظ کے سر پہ تو کہیں روح الامیں نہیں

مجھ سا گناہ گار سزا اور لطف ہو ‌ ‌ ‌ جنت بھی مل چکی مگر اب تک یقیں نہیں
نالے اگر کرے تو اڑاؤں گا خاک میں ‌ ‌ ‌ یا آج آسماں نہیں یا زمیں نہیں
چھپکے جا نکلے ہجر کی شب میں تو کس طرح ‌ ‌ ‌ اوجھل ذرا نگاہ سے وہ مہ جبیں نہیں
دوزخ میں میں بلک کے پکاروں گا یا کریم ‌ ‌ ‌ آئے نہ تجھکو رحم یہ ہرگز یقیں نہیں

اے نظم کون حسن پرستی سے چھوٹ رہا
۱۰۷ ——— قرآں اٹھائیے شیخ تو ہم کو یقیں نہیں ——— ۱۳

کیا ہو یقیں ملیگا وہ ہم کو یہاں نہیں ‌ ‌ ‌ اپنا ہی اس جہاں میں پتا یا نشاں نہیں
مژگانِ تر سے چھپکے چلے اے امینِ حجاب ‌ ‌ ‌ ڈرتا ہوں اڑ نہ جائیں تری دھجیاں کہیں
یارب وہ تیرگی شب غم کی ہوئی نمود ‌ ‌ ‌ بنجائے یہ سمٹ کے نہ سیل رواں کہیں
سمجھے تھے ہم کہ سجدۂ طاعت ادا کیا ‌ ‌ ‌ دیکھا تو سر کہیں ہے ترا آستاں کہیں
گنبد میں آسماں کی چھپا تھا قضا سے میں ‌ ‌ ‌ کیا جانتا تھا یہ نہ ملے گی اماں کہیں
باتیں بنا بنا کے وہ مکرے تو کیا عجب ‌ ‌ ‌ جس نے کہ ایک بات میں سو مکریاں کہیں
وقت عزیز شیشہ سے نازک ہے ڈر یہ ہے ‌ ‌ ‌ پتھر کی سل بنے نہ یہ خواب گراں کہیں
کیا سر کے بل گئے ہیں عدم کی سفر میں لوگ ‌ ‌ ‌ اس راہ میں قدم کا نہ پایا نشاں کہیں
آواز ایک کی نہیں جا سکتی ایک تک ‌ ‌ ‌ نالاں ہمیں نہیں ہیں جرس کارواں میں
لے چل مجھے بھی ای شب عشرت تو اپنے ساتھ ‌ ‌ ‌ ڈرتا ہوں میں قصاص نہ لے آسماں کہیں
دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا ‌ ‌ ‌ بھڑکی ہے ایسی آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

سب قافلہ تو جا بھی چکا نظم اب تو چونک
ایسے میں کچھ نشانِ قدم پائے جاتے ہیں

مفعول فاعلاتن دوبار

اس واسطے عدم کی منزل کو ڈھونڈتے ہیں
مدت سے دوستوں کی محفل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ دل کے پار ہو کر پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں
تیرِ نگاہ اس کے بسمل کو ڈھونڈتے ہیں

اک لہر میں نہ سمجھے ہم کیوں اے حباب دیکھا
یوں آنکھ بند کر کے ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

طرزِ کرم کی شاہد ہیں میوہ دار شاخیں
اس طرح سر جھکا کر سائل کو ڈھونڈتے ہیں

ہے وصل ہجر اپنا اے قیس طرفہ مضموں
محمل میں بیٹھے ہیں اور محمل کو ڈھونڈتے ہیں

طولِ امل کا رستہ ممکن نہیں کہ طے ہو
منزل پہ بھی پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

حسرت شباب کی ہے ایامِ شیب میں بھی
معدوم کی ہوس ہے زائل کو ڈھونڈتے ہیں

اٹھتے ہیں وہ لوسلے کچھ ہر بار درد دیکر
کیا جانیے جگر کو یا دل کو ڈھونڈتے ہیں

زخم جگر کا میرے ہے رشک دوستوں کو
مرتا ہوں میں کہ یہ کیوں قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

اہل ہوس کی کشتی یک بام و دو ہوا ہے
دریائے عشق میں بھی ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

آیا جو رحم مجھ پر اس میں بھی چال ہے کچھ
سینہ پہ ہاتھ رکھ کر اب دل کو ڈھونڈتے ہیں

کرتے ہیں کار فرہاد آساں زمیں میں بھی
مشکل پسند ہیں ہم مشکل کو ڈھونڈتے ہیں

اے خضر پے خجستہ بہر خدا کرم کر
بھٹکے ہوئے مسافر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

دل خواہ تیرے عشوے دل جو ترے اشارے
وہ دل لوٹتے ہیں یہ دل کو ڈھونڈتے ہیں

اے نظم کیا بتائیں حج و طواف اپنا
کعبہ میں بھی کسی کی محمل کو ڈھونڈتے ہیں

۱۱۰ | ۲۰

کیا کارواں ہستی گذرا روا روی میں
فردا کو میں نے دیکھا گرد و غبار دی میں

تھے محو لالہ و گل کس کیف بیخودی میں
زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں

یاران بزم عشرت ڈھونڈوں کہاں میں تم کو
تاروں کی چھاؤں میں یا پچھلے کی چاندنی میں

ہر عقدہ میں جہاں کے پوشیدہ ہے کشائش
ہے موج خندۂ گل پنہاں کلی کلی میں

زخموں میں خود چمک ہے اور اس پہ یہ ستم ہے
رنگ پریدہ سے میں رہتا ہوں چاندنی میں

ہم کس شمار میں تھے پرسش جو ہم سے ہوتی
یہ اعتنا نہ پایا آشوب آگہی میں

حکم قضا ہو جیسا سرزد ہو فعل ویسا
بندہ کا دخل بھی ہے پھر اس کی بدی میں

رفتار سایہ کو ہے پست و بلند یکساں
ٹھوکر کبھی نہ کھائے راہ فروتنی میں

وجد آگیا فلک کو غش آگیا زمیں کو

دو طرح کے اثر تھے اک صوت سرمدی میں

تعبیر اس کی شاید اک واپسیں نفس ہو
جو خواب دیکھتے تھے ہم ساری زندگی میں

لائی حباب تک کو سیل فنا بہا کر
اک آہ کھینچنے کو ایک دم کی زندگی میں

محشر کی آفتوں کا دھڑکا نہیں رہا اب
سو حشر میں نے دیکھے دو دن کی زندگی میں

پہلو میں تو ہوا ہے دل پھر حسرتیں ہزاروں
کس بات کی کمی ہے تیری سلامتی میں

پرسان حال وہ ہو اور سامنے بلا کر
کیا جانیئے زباں سے کیا نکلے بیخودی میں

تو ایک ظل ہستی پھر کیسی خود پرستی
سایہ کی پرورش ہے دامان بیخودی میں

حائل بس اک نفس ہے محشر میں اور ہم میں
پردہ حباب کا ہے فردا میں اور دی میں

آنکھیں دکھا رہی ہے دن سے مجھے شب غم
آثار تیرگی کے ہیں دن کی روشنی میں

تونے تو اپنے در سے مجھ کو اٹھا دیا ہے
پرچھائیں پھر رہی ہے میری اسی گلی میں
سجدہ کا حکم مجھ کو تونے تو اب دیا ہے
پہلے ہی لکھ چکا ہوں میں خط بندگی میں
اے نظم چھیڑ کر ہم تجھ کو ہوئے پشیماں
کیا جانتے تھے ظالم رو دیگا دل لگی میں

۱۱۱

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

صبح غم کی یہ شعاعیں نیشتر سے کم نہیں
چاک داماں سحر چاک جگر سے کم نہیں
حسن کی ترکیب دیتی ہے گلستاں کا جواب
قد شجر سے کم نہیں اعضا ثمر سے کم نہیں
زلف کا چہرہ پہ آنا ہے ستم ہنگام دید
ایک لمحے بھر بھی مجھکو رات بھر سے کم نہیں
جھک گیا ہوں ضعف سے گردش ہے قسمت میں ابھی
پاؤں کا چکر مرا دستار سر سے کم نہیں
میری از خود رفتگی بے روئے کم ہوتی نہیں
آپ میں آنا بھی دریا کے سفر سے کم نہیں

سجدہ کرتا تھا وہاں میں سر پٹکتا ہوں یہاں
آستانِ یار بھی کعبے کے در سے کم نہیں

کیا بتاؤں بادیہ پیما ہوں میں کس راہ میں
پاؤں میں جو آبلہ ہے وہ گہر سے کم نہیں

بل پہ بل کھانا ستم کا ہے بلا کا پیچ و تاب
بال بال اس زلف کا موئے کمر سے کم نہیں

اس میں رہتا ہے کسی کے روئے روشن کا خیال
خانۂ دل اپنا آئینہ کے گھر سے کم نہیں

انتہا کیا نہیں ہے گوشب فرقت کا طول
لیکن اپنا رنگ اڑ جانا سحر سے کم نہیں

منہ پہ منہ رکھ کر جو رویا پہنچے گوشِ یار تک
نظم اپنا ایک ایک آنسو گہر سے کم نہیں

۲۵ ۱۱۲

یاس و امید اس طرح ہے خاطرِ دلگیر میں
ہو اندھیرا اور اجالا جس طرح تصویر میں

دم بھی لے سکتا نہ انساں گردشِ تقدیر میں
گر کشش ہوتی نہ اتنی خاک دامن گیر میں

باڑہ پیدا آنکھ کے سرمے کی شمشیر میں
دیکھئے پلکوں کی صف نے پر لگائے تیر میں

دم نہیں ہے صید گاہ حسن کے نخچیر میں
آرزوئیں دل میں ہیں یا دل ہے کسی کے تیر میں

ہو چکے ہیں خاک دونوں ہے ہوا چلنے کی پر
صلح ہو جائیگی اب دارا و عالمگیر میں

عشق سکھلاتا جو یک روح و دو قالب کا عمل
جان اپنی ڈال دیتے ہم تری تصویر میں

صید کے دھوکے میں کیا جانے کیا تھا کس کو قتل
ڈال دیں قاتل نے بانہیں گردن نخچیر میں

ابروؤں میں تیرے ظالم اور کماں میں فرق ہے
کام ہوا سکے اشارہ میں تو اس کے تیر میں

رات کو تارے کھلے تھے صبح کو کلیاں کھلیں
واشد خاطر نہ تھی اک میری ہی تقدیر میں

وصف تیرا ایک سے بھی ہو نہیں سکتا بیاں
ہے زباں تقریر میں عاجز قلم تحریر میں

خرمن صبر و سکوں کی یا الہی خیر ہو

آج بجلی کی چمک ہے آو سب تاثیر میں

کعبہ و بت خانہ عارف کی نظر سے دیکھیے
خواب دونوں ایک ہی ہیں فرق ہے تعبیر میں

اس کی ایک ایک بات کو دیتا ہوں میں سو سو جواب
طول موسیٰ نے دیا تھا جس طرح تقریر میں

آپ سے ہو کر مخاطب محو ایسا ہو گیا
عرض مطلب کو میں بھولا لذت تقریر میں

میں اگر زنداں سے اٹھا جان لے محشر اٹھا
اے جنوں شور قیامت ہے میری زنجیر میں

کہکشاں کے حلقہ حلقہ سے یہ مضموں ہے عیاں
باندھ کر رکھا ہے فیل مست کو زنجیر میں

جس قدر تڑپا اسیری اس قدر بڑھتی گئی
طوق آخر کو الجھ کر رہ گیا زنجیر میں

سر جو ٹکرایا تو دیواروں کو رنگیں کر دیا
ایڑیاں رگڑیں تو ... صیقل ہو گئی زنجیر میں

کم نہیں رخت عروسی سے محرم کا لباس
لاکھ زیور کا مزہ ہلکی سی اک زنجیر میں

لعل پڑے گیسو تو بند ہنا اک مصیبت ہوگیا
زلف ہیکل میں کبھی او تجھی کبھی زنجیر میں

زلف کے سودے میں آیا اوسکی آنکھوں کا خیال
اور دو حلقے زیادہ ہوگئے زنجیر میں

ہو رہی ہے قصر تن کی مہر و مہ سے پرورش
اوٹھ رہی ہیں درہم و دینار اس تعمیر میں

پڑھ کے کاجل سے بھی تجھ کا جل کا لگنا ہے ستم
سرمگیں آنسو لگا دیتا ہے پیکاں تیر میں

اس نے دیکھا جب لگا کر دانت پر تلوار کو
آب گوہر مل گئی آب دم شمشیر میں

تجھ سے ہم کہتے تھے اسے نظم منہ سے اُف نہ کر
ہوگیا کفران نعمت شکوہ تقدیر میں

۲۲ ۱۱۳

درد دل سے عشق کے بے پردگی ہوتی نہیں
اک چمک اوٹھتی ہے لیکن روشنی ہوتی نہیں

آئینہ دار خیال یار ہے جوشش سرشک
کون سا شیشہ ہے وہ جس میں پری ہوتی نہیں

سو کے اوٹھنے کا تیرے کچھ اور ہی انداز ہے
اس طرح خورشید کی تیوری چڑھی ہوتی نہیں
جلنے والے جل کے رہ جاتے ہیں کیسا دیکھکر
صبح کو ہونٹوں پہ جب شب کی مسی ہوتی نہیں
کیا کہوں میں توڑتا شیشے سے ٹکرا کر اوسے
تو یہ زاہد بوقت میکشی ہوتی نہیں
وصل کی شب والے ہے میرا او رکسی کی کروٹیں
دیکھوں تو پامال حسرت کونسی ہوتی نہیں
شکوہ بیداد پر کیا ہو تلافی کی امید
ناز ہوتا ہے اوسے شرمندگی ہوتی نہیں
آنکھ بھر کر دیکھنے سے اوس کے جو ہوتا ہے حال
ساغر سرشار سے یہ بیخودی ہوتی نہیں
دیدہ حیراں کے آگے ہوتی ہیں جو شوخیاں
محرم اس ناز و ادا سے آرسی ہوتی نہیں
ہے شب غم میں زمانہ میری نظروں میں سیاہ
کہہ رہا ہوں آج اتبک روشنی ہوتی نہیں
گوشہ عزلت ہے جز ورد عالم سے الگ

غم یہاں مرنے کا جینے کی خوشی ہوتی نہیں

یہ مرض ہستی کا اسے خضر اور بے رہبر تم
پی گئے آب بقا اب زندگی ہوتی نہیں

دل اٹھا لینے میں دنیا سے وہ ملتا ہے سکوں
اہل دل کو اس سے بہتر دل لگی ہوتی نہیں

دولت کونین ملتی ہے جو طالب ہوں ابھی
اپنی ہمت ہر کہ اب تک ملتجی ہوتی نہیں

شبنم و گل برق و باراں جام و مینا کا ہے ساتھ
کس کے رونے پر زمانے میں ہنسی ہوتی نہیں

دل کے ابنائے زمانہ سے ملے کیا مجھ کو لطف
دوستی بنتی نہیں ہے دشمنی ہوتی نہیں

آسیائے چرخ ہے مدت سے اور عظم رمیم
قسمت اجزا ابھی تک منتہی ہوتی نہیں

سیدھی سادی راہ کوئی بیکسی کی راہ ہے
بیچ میں دیوار گردنا کسی ہوتی نہیں

آئینہ کی طرح سینے سے دل کو میں رکھتا ہوں صاف
خوب ہو یا زشت مجھ سے بیرخی ہوتی نہیں

غیر ممکن ہے کہ یک دل یک زباں ہو ساری خلق
جب کہ دو شخصوں کی صورت ایک سی ہوتی نہیں

پڑ گیا ہے پھیر کچھ معرفت کی راہ میں
دوڑتے سب ہیں رسائی ایک کی ہوتی نہیں

اس زمیں میں اور کچھ اشعار رندانہ سنا
نظم اہل ذوق کو سیری ابھی ہوتی نہیں

۱۲ ۱۱۴

دل نہ ہوتا گر تو پھر کچھ دل لگی ہوتی نہیں
غم کبھی ہوتا نہیں حسرت کبھی ہوتی نہیں

لوٹتے رہتے ہیں تجھ پر جلنے والوں کے دل
ورنہ یوں پوشاک تیری ملگجی ہوتی نہیں

دور ہیں فصل خزاں کے آشیاں سے کیا غرض
پھونک دیتے ہم اگر بجلی گری ہوتی نہیں

کاتبان نامۂ اعمال نے دہرا دیا
ہم کو بچ جاتے اگر لکھا پڑھی ہوتی نہیں

دل رہین عشق ہو کر مال ان کا ہو گیا
بیچ لیتے ہم اگر آئی گئی ہوتی نہیں

ہجر کی تاریک راتیں تھیں جو قسمت میں مری
کاشکے یہ چار دن کی چاندنی ہوتی نہیں

خون پی کر غم نہ کر دیتا اگر صید زبوں
اے اجل تجھ سے مجھی شرمندگی ہوتی نہیں

در کھلے ہیں آسماں کے می پرستوں کے لئے
ورنہ یوں تکلیف از خود رفتگی ہوتی نہیں

ہو گیا از ننگ تعلق پا مانع سیر و سلوک
دوڑتے گر پاؤں میں مہندی لگی ہوتی نہیں

پھر اگر بیچا غزال سی جھجک کے ہم کرتے سلام
سرو گلشن میں جو اتنی راستی ہوتی نہیں

ملنے والا تھا دل حسرت زدہ جس دن مجھے
کاش عالم میں وہ ساعت وہ گھڑی ہوتی نہیں

نظم جب تک ہو سکے از کس شخص چاہیے
ہم خدا تجھ کو سمجھتے گر خودی ہوتی نہیں

115

9

ولہ

حرص را خون کردن و دل را تونگر داشتن
این عمل کم نیست از کبریت احمر داشتن

نسخهٔ تسخیر دلهای جهان دانی که چیست
حرف شیرین و زبان چون موج کوثر داشتن

ای که میداری سفر در پیش و عزم جان آزا
زاد راه است دل از این جهان برداشتن

تا نهادستی جبین عجز بر خاک نیاز
پس ترا زیباست سر تا آسمان برداشتن

بر سر آوردن سپهر و ناتمامان گاه وقتها
پست چون چراغ بسوالی به کشته داشتن

تا توانی دور کن زنگ هوس از خاطرت
ورنه آسان نیست چون آئینه جوهر داشتن

شیشهٔ شک در رهِ تحقیق میدانی که چیست
خار در پیراهن و نشتر به بستر داشتن

تکیه بر لطف خداوند کریم است آخر کار
بهتر از اندیشهٔ گرد اندر و لشکر داشتن

دوش احمد هست معراج امیر شب شکن
پس مرا چه حاجت است اندرون کعبه و منبر داشتن

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

امن اس دور قمر میں فلک پیر نہیں
ہے کف افعیٔ شب کاسۂ تقدیر نہیں

دل میں سمجھے ہوئے ہیں اسکو ہم بھی کچھ ہیں
خواب وہ دیکھا ہے جسکی کوئی تعبیر نہیں

سیف قاطع ہیں یہ نشتے کیلئے احکام قضا
ہے یہ بسمل کی تڑپ حیلہ و تدبیر نہیں

آفریں خامۂ نغمہ و رنگیں گفتار
عندلیبوں کے ترانے ہیں یہ تحریر نہیں

باغ سبز اپنا دکھا ہمکو نہ اے طول امل
سمجھے بیٹھے ہیں کہ توقف نہیں تاخیر نہیں

دم شماری میں گزر جاتی ہے انسان کی عمر
اس میں تقدیم ذرا بھی نہیں تاخیر نہیں

۱۱ ۲۴

آپ کو میرے دل زار سے کچھ کام نہیں
غیر تو غیر سہی تکرار سے کچھ کام نہیں

مشغلہ یہ بھی رہا دست جنوں کا چند ہی
اب گریباں کے کسی تار سے کچھ کام نہیں

زخم سود ورجو سینہ پھری ہوئی بیٹھی ہیں
ہیں مسیحا جنھیں بیمار سے کچھ کام نہیں

رشک انجم سحری ہے تیرا آویزۂ گوش
اس ستارہ کو شب تار سے کچھ کام نہیں

مجھکو طوطی کی طرح ذوق نواسنجی ہے
ورنہ آئینۂ رخسار سے کچھ کام نہیں

وعظ کہنے کو چلے آئے ہیں میخوار و نہیں
شیخ کو خانۂ خمار سے کچھ کام نہیں

ابر کی طرح سبک روح گذر جاتے ہیں
خلش وادیٔ پرخار سے کچھ کام نہیں

مشغلہ شیخ نہیں جوش میں ہم والہان نسیم
مجھکو خار سر دیوار سے کچھ کام نہیں

قلزم عشق کا پایاں نہیں ہے نہ سہی
ڈوب مرنا ہے تو منجدھار سے کچھ کام نہیں

کہتا ہے راز نہاں آتش جاں سوز مغیں
او زباں کہتی ہے اظہار سے کچھ کام نہیں

صبح نو سر سے چٹکنے کی نہ ہوگی لیکن　　آج گرتے ہوئے دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

نظم اب ترک محبت کا زمانہ ہے قریب
اور جانب نگہ یار کو ہم دیکھتے ہیں

مفاعیلن چار بار

۱۴۰ ۲۰۱

تو بس جب تک ہو آنکھیں دیدہ وادیدہ حیراں کر لیں
بندھا ہے تار جب تک تماشا تیلیاں کر لیں
اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں
قفس کو خونفشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں
گنہ اپنا سبکساری سے گردوں ثقل کے در پے
جو کہنا ہو وہ کہہ سن لیں جو کرنا ہو بیاں کر لیں
سفر تو اس قدر ہو دور کا اور پھیر کا رستہ
مناسب تھا کہ بے ناقہ کو محمل کو گراں کر لیں
حسینوں کی بہار حسن ہے مہمان دو روزہ
ادائیں گر سیاں کر لیں نگاہیں شوخیاں کر لیں
ضعیفی ہے نہیں ہم کو شکایت قد کے جھکنے کی
زمیں سے کچھ دنوں فریاد و جور آسماں کر لیں
غرض ہے کسب عرفاں مجھکو بتخانہ میں آنے سے

جنھیں طوفاں اُٹھانا ہو وہ جو چاہیں گماں کر لیں

نہ آنا اے اجل تجھ کو قسم ہے وقتِ آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائیگاں کر لیں

خضر کو فاتحہ دینی ہے گر ہم خاکساروں کی
تو پہلے چشمۂ آبِ بقا سے کُلیاں کر لیں

خبر اس کی نہیں تجھ کو دام زیرِ کاہ پنہاں ہے
ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کر لیں

ہمارے ضبط کی گر پردہ داری دیکھنا چاہے
تو آ اے برق تجھ کو آشیاں میں ہم نہاں کر لیں

عجب کیا گر نہیں ملتا مرے سینہ میں تیر اُن کا
وہ ناوک پر قیاسِ معنیٔ خاطر نشاں کر لیں

نہ ہو کوئی ہنر انساں میں اک شیریں زبانی ہو
یہ افسوں پڑھ کے دشمن کو بھی ہم تو مہرباں کر لیں

ہماری رندی و مستی تو قابل منع کے ٹھہری
سرِ منبر بھلا واعظ تو ٹھنڈی گرمیاں کر لیں

سمجھتے ہیں کہ جینا نزع کی حالت میں بھی اچھا
جو بس ہو تو اجل کو کچھ دنوں ہم میہماں کر لیں

بھلا کیا فائدہ اہل جہاں سے ہم سخن ہو کر
اثر اتنا تو ہو آخر کسی کو ہم زباں کر لیں

ہمیں اس بزم میں دو صحبت گر نظر آ سے
کلیجہ میں چھپا لیں اس کو آنکھوں سے نہاں کر لیں

مسیحا اٹھ لے بالیں سے ذرا ٹھہر تم تڑپا اور تو ہے
ٹھہرا ے وردِ دل اتنا کہ کہ درد دل بیاں کر لیں

چلا میں بزم سے پھر ذکر میرا نا مناسب ہے
شکایت میری جو کرنا ہو مجھ سے مہرباں کر لیں

ہوا یہ جب کہ ثابت عیش دنیا کا خیالی ہے
خیال عیش سے لازم ہے دل کو شادماں کر لیں

خزاں کے خوف میں گھلنے سے یہ اے نظم بہتر ہے
تماشائے گل و ریحان و باغ و بوستاں کر لیں

۲۰ ۱۲۱

گزرتے ہیں تو مثل سیل عالم سے گزرتے ہیں
ٹھہرتے ہیں تو مثل نقش پانی پر ٹھہرتے ہیں

صبا کی طرح پھیرا کوچہ ہستی کا کرتے ہیں
کہ آزادانہ آجاتے ہیں مستانہ گزرتے ہیں

تمہارے گیسوؤں کی برہمی کچھ ہو گئی ہے
گرنے سے پیشتر نہ بکھرتے دیتے ہیں

حباب اٹھ کر ٹھہرا بکھر سکتا تا سطح آب آیا
ابھرنے والے جو ہیں ناتواں تو گرا دیتے ہیں

اگر فقر و غنی کے مسئلہ کو غور سے دیکھو
تو سچ یہ ہے کہ دونوں نقطے حق ٹھہرتے ہیں

قلم سے ذوق سجدہ جادۂ تسلیم میں سیکھو
جو ہیں اہل وفا یوں سر تہ شمشیر دھرتے ہیں

درستی ہوں دل اپنے جب چہرے کی صفائی پھر کہاں ممکن
کہیں یہ داغ مٹتے ہیں کہیں یہ زخم بھرتے ہیں

صدائے طبل تہی کی ہے یہ شہرت اور یہ آوازہ
ہوائیں بھر کے ارباب ہوس ناحق ابھرتے ہیں

یہی دل ہے تو جینا ہو چکا اب عشق بازوں کا
تماشا ہے کسی کی شکل اچھی ہو تو یہ مرتے ہیں

ضعیفوں کے قد خم گشتہ ظالم وہ کمانیں ہیں
کہ جن کے تیر پشت چرخ گردوں سے گزرتے ہیں

۱ قرار بحر دریا کی تہ ۱۲

نہیں ڈرتے زمانہ جتنا چاہے امتحان کر لے
کھرے ہوتے ہیں جو وہ آگ میں گر کر نکھرتے ہیں
پرائے دل کی حالت کو کوئی اے نظم کیا جانے
سمجھتے ہیں وہی جو دل پہ اپنے ہاتھ دھرتے ہیں

١٦ — ١٣٢

تری محفل میں جو آتے ہیں کچھ کھو کر نکلتے ہیں
وہ ہر سو ڈھونڈتے اپنا دل مضطر نکلتے ہیں
شگوفے لے کے سر پر طبلۂ عنبر نکلتے ہیں
گل تر ساتھ سلگائے ہوئے مجمر نکلتے ہیں
بہار آئی اوٹھا ہے جوش خون لالہ و گل میں
رگ سودا میں ہم ڈوب کر نشتر نکلتے ہیں
کسی کے مطلع ابرو کو ہم نے پڑھ کے دیکھا ہے
عجب انداز پایا ہے عجب تیور نکلتے ہیں
شب غم اک بلائے بد ہے تارے ہیں گنوں کیونکر
ستارے بھی کچھ اس کے سایہ میں بچ کر نکلتے ہیں
جنھوں نے دل لگایا ہی نہیں وہ لطف کیا جانیں
اجل کس طرح آجاتی ہے دم کیونکر نکلتے ہیں

نہ پوچھو کاوشِ مژگاں ستی تیرے دل پہ کیا گزری
کہ یہ آنسو وہی ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں

بیابانِ بلا کی راہ سیدھی مل گئی مجھکو
بگولے سیکڑوں کھاتے ہوئے چکر نکلتے ہیں

ہراس بیمارِ غم کو دھن اوسی محفل میں جانے کی
مسیحا و خضر جس بزم سے مر کر نکلتے ہیں

بھری ہیں صانعِ قدرت نے موتی کوٹکر تجھ میں
عرق جو شرم سے آیا وہی گوہر نکلتے ہیں

جو نا پا تو حسینوں سے قدم تک تھا سرِ محشر
یہ ظالم حشر کے فتنہ سے بھی قد بھر نکلتے ہیں

مری فریاد اور لٹے گلا میرا دبا تی ہے
مرے نالے مجھی پر کھینچ کر خنجر نکلتے ہیں

بنائے جاتے ہیں کاجل کے دنبالے دمِ تزئیں
الٰہی خیر ہو تیرِ نگہ کے پر نکلتے ہیں

اشارہ ہی یہی اس شوخ کی ترچھی نگاہوں کا
انھیں گوشوں سے اکثر فتنۂ محشر نکلتے ہیں

نہیں کوشش ہی کچھ دیوانگانِ عشق کو حاصل

جو پہلے سر پہ پیتے تھے وہ دبلا پکر نکلتے ہیں

ہوا نے وید لے اڑتی ہے مخشہ ہو کر کوثر ہو

نفس میلوں میں ہم تخت سلیماں پر نکلتے ہیں

صدائے چنگ سے مجھکو یہی آواز آتی ہے

یہ کہتا ہے کوئی پردے سے ہم باہر نکلتے ہیں

گدائے بے نوائی ایک ٹھوکر سے جو گر دائے

ابھی لڑتے ہوئے دارا و اسکندر نکلتے ہیں

اٹھانے ہیں جہاں میں داغ جوہر گر نہ ہوونگا

یہ تیرے چند درہم اے فلک مجھ پر نکلتے ہیں

لگا کر جاتے ہیں یوں روز سیاہ بار سیاہ بخت پر

ستارے جس طرح راتوں میں چھپ چھپ کر نکلتے ہیں

نشان سوز غم باقی ہو میری خاک میں اتنا تک

دل پر داغ کے ٹکڑے ہیں جو اخگر نکلتے ہیں

کوئی دیکھے تو پہلے آپ سے باہر ذرا ہو کر

ابھی اس گنبد بے در سے صد بادر نکلتے ہیں

دل بے آرزو جب ملانے قلم حیران ہوں

کسی کے منہ سے حرف آرزو کیونکر نکلتے ہیں

کھٹک ہر سانس میں ہر ہر نفس کے ساتھ نالے ہیں
کہ دل نازک ہے میرا اور دل کے زخم آلے ہیں

حیا میں ناز بھی ہے منہ پہ وہ آنچل جو ڈالے ہیں
ادا میں شرم بھی ہے اس طرح دامن سنبھالے ہیں

تری محفل میں مجھ سا کشتۂ حسرت نہیں کوئی
اداؤں نے بھی پر حوصلے دل کے نکالے ہیں

حجاب آتے ہی مژگاں کی صفیں تو جائیں گی برہم
یہ ترکانِ قدر انداز گھونگھٹ کھانے والے ہیں

طریق عشق میں ہر ہر قدم ہے کام اژدر میں
وہاں ہارے کے چھالے ہیں جو تلوؤں کے چھالے ہیں

نہ پہونچے فیض اپنوں سے تو شکوہ اسکا کیا کیجے
حباب بحر دست موج میں خالی پیالے ہیں

نہ ڈھونڈیں گے کہیں اب خانۂ دل کے سوا اسکو
مکاں کعبہ سے لیکر عرش تک سب دیکھے بھالے ہیں

جنھیں تکیہ خدا پر ہو زمیں پر کیوں قدم رکھیں
مصلے آب پر دوش ہوا پر مرگ چھالے ہیں

ملیں وحشت میں جاگیریں مجھے فرہاد و مجنوں کی
گریبانوں کے پرزے کوہ و صحرا کے قبالے ہیں

تری تصویر کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی لیکن
مری آنکھوں میں اب تک کچھ اندھیرے کچھ اجالے ہیں

الٰہی رہ گئی تھی خاک میں بھی آہ کچھ باقی
مری مٹی سے جو ساغر بنے ان میں بھی چھالے ہیں

ملال انگیز ہو جاتی ہے افراط طرب آخر
کہ اپنی حد سے نغمے جب گذر جائیں تو نالے ہیں

قلم کی طرح سجدے ہی کروں میں تو اگر پاؤں
کہاں وہ لوگ ہیں جو بات پر سر دینے والے ہیں

کرم سے اس کے ہیں سامان کیا کیا بادہ نوشی کے
کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں کبھی بادل کے جھالے ہیں

وہ ناداں ہیں جو ملک و مال کو اپنا سمجھتے ہیں
کہ یہ آج اس کے قبضے ہیں کل اس کے حوالے ہیں

وہ اب کے سال ہے بوتل کا کاگ اڑنے میں کیفیت
عمامے زاہدوں نے مست ہو ہو کر اچھالے ہیں

نہ چھوٹی مر کے بھی اہل جہاں سے [illegible] آرائی

کفن کا سہرے کا اور تابوت کے اوپر دوشالے ہیں

جہاں تو جلوہ گر ہوتا ہے ستم ضبط فغاں کرنا
سمجھے آتے ہیں ان پر ستم جو دل کو سنبھالے ہیں

جو پہلے جا پہنچے انتظار میں ان کو تو کیا رونا
بڑھے جاتے ہیں وہ آگے جو میرے ساتھ والے ہیں

١٢ ١٢٥

ہوئی ہے کثرت نشو و نما فصل بہاری میں
کہ پلکیں دوڑتی ہیں نکہت گل کی سواری میں

مجھے فرقت کی شب یہ سوجھ سے اختر شماری میں
ستارے کہکشاں میں ہیں کہ دندانے ہیں آری میں

گریباں پھاڑیے گل کی طرح فصل بہاری میں
کہ دم گھٹنے لگا اب تو جنوں کی پردہ داری میں

حباب آسا نکلتے ہیں ہم اسراب دشت کچھ ہیں تو
کہ بوئے اعتبار آتی ہے اس بے اعتباری میں

مرے حصے میں جام جم نہ کیوں اس بزم میں آئے
کہ میں بھی تو ہوں یکتائے زمانہ بادہ خواری میں

جنوں تکمیل سے بہتر ہے کہ ہرگز ہو نہیں سکتا

تغیر آب راکد کی طرح سے آب جاری میں

اٹھائی گو درو گوہر کے ہیں ہر اک سے جھلکتا ہوں

مجھے کان جواہر مل گئی ہے خاکساری میں

اجل نے تو مجھی چھوڑا کہ اک صید زبوں یہ ہے

یہاں دشوار جینا ہو گیا اس شرمساری میں

پشیماں ہوں کہ تجھکو شاہ خوباں کیوں کہا میں نے

نہ کی پھر بات ہی مجھ سے غرور شہریاری میں

ٹھہر اے سیل گریہ ہی جو عکس یار کی طالب

صفائی کی ہر صورت غیر ممکن بیقراری میں

غریب آزار کو فرعون اہل دل سمجھتے ہیں

وہ تخت عاج پر نکلے کہ سونے کی عماری میں

ہے اس سفاک کا بھی سامنا محشر میں ہو حیدر

خدا جانے کہوں کیا عالم بے اختیاری میں

۱۰ ۱۲۶

ابھی تک بحث امر کن فکان جاری ہے عالم میں

فنا اک دم میں ہو سارا جہاں موجود اک دم میں

یعنی فیضان وجود ہر آن میں نہ ہوتا رہے تو عالم فنا ہو جائے آفتاب کی شعاعوں

جوانان چمن اترا نہ جائیں حسن پر اپنے
جہاں کی بے ثباتی آئینہ ہے دستِ شبنم میں
مری آنکھوں کے آگے تو نہ کر خوں ای اجل انکا
چھپا رکھی تھی ہیں نے آرزوئیں جان پرغم میں
کرو نیکی کسی سے مفت سب ممنونِ منت ہوں
جہاں ڈوبا ہوا ہے چشمہ احسان حاتم میں
سلیمان جہاں سمجھوں نہ کیوں اہل مروت کو
تبسم ہے لبِ رنگیں پہ جیسے نقش خاتم میں
حیا دی ہے خدا نے آنکھ میں اہل سعادت کی
نگہ ہے پرورش پائے ہوئے دامان مریم میں
فریب اہل دنیا سے نہیں مردِ خدا ڈرتے
حقیقت حیلہ روباہ کی کیا چشم ضیغم میں
مجھے اس عالم افتادگی میں رشک آتا ہے
کہاں سے آگئی یہ طاقت پرواز شبنم میں
عجب ہے بزمِ مے میں سیر کرنا سارے عالم کی
کوئی قطرہ شرابِ عشق کا تھا ساغر جم میں

بقیہ | کا سلسلہ ذرا سو قوفہ ہو تو دنیا تاریک ہوجائے گی کل یوم ہو فی شان ۱۲

ملی شاہ و گدا کی خاک تو ہوتی تھیں یہ باتیں
ملاپ آخر ہوا اک عمر کے بعد آپ میں ہم میں

۱۲۷ — مفاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل — ۲۰

گمراہ کیا نفس نے دنیای دنی میں
رہزن کا مرا ساتھ ہی اس ہم وطنی میں

تنہا نہ ملا گوشہ مرقد بھی کسی کو
سنتی ہیں کہ کشتی ہوئی ویس قرنی میں

مقتل میں مجھے یوں جگر و دل نظر آئے
یہ تیر[1] کے پیکاں میں وہ برچھی کی انی میں

سینہ میں ٹھہرتا نہیں دم تا بہ دم مرگ
کیسا یہ پس و پیش ہی امر شدنی میں

آئی تو کسی طرح سی اس بت کو تبسم
بجلی کی چمک دیکھ لو ہیرے کی کنی میں

جس نخل کو سیل فنا دیتی ہی پانی
مصروف اوسی نخل کی ہی بیخ کنی میں

لازم ہی کہ دامان و گریباں میں ہو چاک
ہی موسم گل لطف ہی گل پیرہنی میں

کچھ پیر مغاں سی تجھے نسبت نہیں زاہد
ہوتا ہی بڑا فرق کریم اور دنی میں

رنگت تری لب کی ہی نزاکت نہیں لیکن
یاقوت بدخشاں نہ عقیق یمنی میں

بجلی سی چمک جاتی ہی کھنچتا ہی جو توسن
شاید دل بیتاب ہی برچھی کی انی میں

اک بات کی جس نے وہ ہوا کشتۂ حسرت
کیا زہر گھلا ہی تری شیریں سخنی میں

قبلہ سے جو نوروز کی اٹھی ہیں گھٹائیں
ڈوبا ہی چمن رنگ عقیق یمنی میں

رہزنی میں ہو نفس تو کر قتل کی تدبیر
کیا فرق ہی گردن کشی و گردن زدنی میں

[1] تیر اور برچھی مژہ اور نگاہ کے معنی میں ہے ۔ ۱۲

ہی نفس کی اصلاح تو بس نفس کشی میں
پر گر سخن تلخ میں بھی نہیں یہ بات
ساتھ آئی ہے کچھ گرد کدورت جو وطن سے
چلتے ہیں وہ اب راہ ساری یہ قلم کے
مل جائیگا محشر میں دل اس مرید جو کہی
کافر ہوں کسی بات کا مجھکو جو یقیں ہو
کرتے ہیں وہ ظلم اور پشیماں نہیں ہوتے

کچھ دل کی درستی ہے تو بس دل شکنی میں
کچھ کام نکلتا ہے تو شیریں سخنی میں
پروا مجھے مرقد کی نہیں بے وطنی میں
جو شہرہ آفاق تھے شمشیر زنی میں
عادت یہ ہمیشہ کی ہے اس نا شدنی میں
ملتا ہے مزہ آپ کو پیماں شکنی میں
سمجھے ہیں کہ آواز نہیں دل شکنی میں

اندیشہ ہے رہزن کا بھی ہر راہ گذر میں
آنکھیں مری یوں محو تماشا ہیں دو تو سال
کہتے ہیں غلط تیر لگا یا نہیں تو نے
افسانہ رہا محفل عشرت کا ہمیشہ
پر خوف یہ منزل ہے سبکبار گذر جا
ہیں شہر خموشاں میں کسی جا کی پکار و
دیتا ہے وہ نعمت تو اٹھائی نہیں اٹھتی
گر اہل جہاں داغ اٹھائی نہیں جاتے
بچپن سے جوانی ہے جوانی سے بڑھاپا

اس طرح سے غافل کوئی سوتا ہی سفر میں
وہ داغ تجھے گویا پر طاوس نظر میں
خود میں نے چھپایا ترے ناوک کو جگر میں
وہ شمع کا جلوہ نہ رہا رات ہی بھر میں
برسوں سے یہ آتی ہے صدا راہ گذر میں
در ہے مگر آواز نہیں حلقہ در میں
پھولوں سے لچک آ گئی شاخ گل تر میں
پھر کس لئے پیدا ہوئی اس دور قمر میں
ہے خاتمہ عمر اسی شام و سحر میں

الجھوں تا مژۂ یار آنکھوں سے اپنی نہ لگاؤں
بھیجا ہو جسے باندھ کے جبریل کے پر میں

مست مئے عرفاں کو کسی طرح سنبھالے
ایسا کبھی ہشیار کوئی آئی خبر میں

اس راہ میں دم نکلے تو کافور ہی کیا کام
گر دینا مجھے دفن اسی گرد سفر میں

کس طرح عنادل کے گلے میں اتر آئے
نغمے تھے نہاں پردۂ برگ گل تر میں

یہ شیشہ گری ابر نے کی ہے کہ ہوا نے
غلطاں بلوریں ہے ہر اک ساق شجر میں

منظور اگر ہو دل مردہ کو جلانا
ہے معجز عیسیٰ نفس باد سحر میں

حسرت ہی کبھی عمر گزشتہ کو کریں یاد
مہلت ہمیں اتنی نہ ملی آٹھ پہر میں

گھیرے ہوئے ہے خلق کو یوں نعمت خالق
جس طرح سے [illegible] شکر میں

نکلا نہ کسی سوزن مژگاں سے مرا کام
برسوں ہی خلش [illegible] جگر میں

کہتی ہے یہ دانتوں کی چمک وقت تبسم
ڈورے کی جگہ برق ہے اس عقد گہر میں

ہے اس کی ادا قاتل عالم دم رفتار
تلوار لگا رکھی ہے نزاکت نے کمر میں

اس بزم میں ہے نظم جنہیں لطف نہ آئے
حافظ کی غزل میں نہ رباعی عمر میں

۱۵ ——— ۱۲۹

مفتعلن مفاعلن (۲) بار

سنگ جفا کا غم نہیں   دست طلب کا ڈر نہیں
اپنا ہے اس پہ آشیاں   نخل جو بار ور نہیں

سنتے ہو اہل قافلہ میں کوئی راہبر نہیں
دیکھ رہا ہوں تم میں سے ایک بھی راہ پر نہیں

موت کا گھر ہے آسماں اس سے کہیں مفر نہیں
نکلیں تو کوئی در نہیں بھاگیں تو رہگذر نہیں

پہلے جگر پہ آہ کا نام نہ تھا نشاں نہ تھا
آخر کار یہ ہوا آہ تو ہے جگر نہیں

صبح ازل سے تا ابد قصہ نہ ہوگا یہ تمام
جور فلک کی داستاں اتنی بھی مختصر نہیں

برگ خزاں رسیدہ ہوں چھیڑ نہ مجھ کو اے نسیم
ذوق فغاں کا ہے مجھے [illegible] و ابر تر نہیں

منکر حشر ہے کدھر دیکھے تو آنکھ کھول کر
حشر کی [illegible] ایسی کوئی سحر نہیں

شبنم و گل کو دیکھکر وجد نہ آئے کسطرح
خندۂ بے سبب نہیں گریۂ بے اثر نہیں

تیرے فقیر کا غرور تاجوروں سے ہے سوا
طرف کلہ میں دے شکن اس کو یہ درد سر نہیں

کوشک و قصر و بام و در تو نے بنا کیے تو کیا

حیف ہو خانماں خراب دل میں کسی کے گھر نہیں

نالہ کشی رقیب سے میری طرح محال ہے

دل نہیں حوصلہ نہیں زہرہ نہیں جگر نہیں

شاطر پیر آسماں واہ ری تیری دستبرد

خسرو و کیقباد کی تیغ نہیں کمر نہیں

شان کریم کی یہ ہے ان سے ہو پیشتر عطا

لطف عطا کا کیا ہو جب ان سے ہو پیشتر نہیں

لاکھ وہ بیرخی کرے لاکھ وہ کج روی کرے

کچھ تو ملال اس کا ہو دل کو مری مگر نہیں

سن کے برا نہ مانیے سچ کو نہ جھوٹ جانیے

ذکر ہے کچھ گلہ نہیں بات ہے نیشتر نہیں

حرف واو

۱۳ ــــــ مفاعیلن چار بار ــــــ ۳۰

ندامت ہے بنا کر اس چمن میں آشیاں مجھ کو

ملا ہمدم یہاں کوئی نہ کوئی ہمزباں مجھ کو

دکھائے جا بجا روانی توسن عمر رواں مجھ کو

ہلال برق سو رکھے ہم رکاب و ہم عناں مجھ کو
تپایا ناتوانی نے سلیمان زماں مجھ کو

اڑا کر لے چلے موج نسیم بوستاں مجھ کو
وہم تیغ ازل سے میں نواسنجوں میں ہوں تیرے

تپایا بلبل سدرہ نے انداز فغاں مجھ کو
میری باتوں میں کیا معلوم کب سوئی وہ کب جاگے

سرے سے اس لئے کہنی پڑی پھر داستاں مجھ کو
بہا کر قافلہ سے دور نسیم زار کو پھینکا

کہ موج سیل تھی بانگ درائے کارواں مجھ کو
یہ دل کی بیقراری خاک ہو کر بھی نہ جائے گی

سناتی ہے لب ساحل سے یہ ریگ رواں مجھ کو
اڑائی خاک جس صحرا میں تیرے واسطے میں نے

تھکا ماندہ ملا ان منزلوں میں آسماں مجھ کو
تصور شمع کا جس کو جلا دے ہوں وہ پروانہ

لگی اٹھنے آگ دل میں جب نظر آیا دھواں مجھ کو
لحد سے عرصہ محشر تک آیا ناتواں ہو کر

کہاں سے حسرت دیدار لے آئی کہاں مجھ کو

وہ جس عالم میں جا پہونچا وہاں میں کس طرح جاؤں
کھوا دل آپ سے باہر پہنا کر بیڑیاں مجھ کو
غبار راہ سے اے نظم یہ آواز آتی ہے
گئی اے عمر رفتہ تو کدھر پھینکا کہاں مجھ کو

نہیں پروا جو ظالم نے مٹایا میری تربت کو
لحد بن جائے گر ظاہر کروں دل کی کدورت کو
کسی نے شعلہ ساں آنچل میں باندھا ہو شرارت کو
گرہ میں باندھتے اب مثل اخگر داغ حسرت کو
ترے ممنون ہم سب رند اے باد بہاری ہیں
اوڑا لاتی ہے میخانہ پہ تو باران رحمت کو
یہ وہ دن ہیں کہ اب آنکھوں کو اپنی ڈھونڈتے ہیں ہم
گئے وہ دن کہ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں اسکی صورت کو
نکل جاتا ہے نام اک شعر اگر اچھا نکل آئے
یہ دو مصرع تو گویا پر لگا دیتے ہیں شہرت کو
ہوا سالک کو حاصل کیا دو صد زانو تامل سے
کہ دیکھا گام اول میں دو صد آئینہ حیرت کو

نگاہ آشنا کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
پس پشت اپنے گویا ڈھونڈھتے ہیں مروت کو
حسینوں کو کیا گرویدہ اس نے آئینہ بن کر
دل وارفتہ نے جس طاق پر رکھا تھا حیرت کو
کہیں الزام محشر میں نہ ہو اس بے تغافل کا
میرے لاشہ پہ لے آئے کوئی اس بے مروت کو
پلک جھپکا کے نرگس کو نہ دیکھا باغ میں ہم نے
جو آنکھیں ہوں تو بس دیکھا کیے صانع کی قدرت کو
بیاباں ہو ابھی زندہ [illegible]
جھٹک دوں میں اگر دامن سے اپنی گرد کلفت کو
نہ تھی [illegible] تدبیر اور نہ کچھ دل کی [illegible]
گریباں سے [illegible] دست وحشت کو

۱۴ ۱۳۲

عجب شوریست از حرف دل [illegible]
شب بازندہ می دارم [illegible] در پہلو
خوشم آید ز ساغر خندہ سرشار [illegible]
خوشم آید ز مینا گریہ مستانہ در پہلو

وفور مستی من کرد برہم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشہ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوہ جانانہ در پہلو
خوشا عرفاں اگر از ما سوا پہلو تہی کردی
ببیں گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
زدم بر شمع بالیں آستینے در شب ہجراں
دلم می سوخت بر بیتابی پروانہ در پہلو
بشمع قامت آں ترک حسن فتنہ زا باشد
کہ خود تیغش بلرزد چوں پر پروانہ در پہلو
تنم را زار کرد است آنچناں سودائے زلف او
نمایاں استخوانہا گشتہ مثل شانہ در پہلو
بشور انقلاب دہر گوئی در غلطان است
بہر پہلو کہ غلطد دارد آب و دانہ در پہلو
ہمانا چارہ داغ دل از مرہم نمی آید
کہ دارم پنبہ بر پہلو و آتش خانہ در پہلو
دلم محو طلسمات جہاں من طالب صانع

ہوائے کعبہ در سر دارم و بت خانہ در پہلو

خوشا وقت قدح خواری کہ گردش می کند باہم

بسرش ساغر و ہم سبحہ صد دانہ در پہلو

چہ طور از نگارستہا کہ بنو شتم باد آخر

کہ ہر یک نقطہ دارد معنی بیگانہ در پہلو

چو گل با خار بینی جائے فریاد است اے حیدر

کہ دل سوزد و لبش پر خندہ و بیگانہ در پہلو

۲۵ ۱۳۴

عبث ہے ناز استغنا پہ کل کی کیا خبر کیا ہو

خدا معلوم یہ سامان کیا ہو جائے سر کیا ہو

یہ آہ بے اثر کیا ہو یہ نخل بے ثمر کیا ہو

نہ ہو جب درد ہی یارب تو دل کیا ہو جگر کیا ہو

جہاں انسان کھو جاتا ہو خود پھر اسکی محفل میں

رسائی کس طرح ہو دخل کیونکر ہو گذر کیا ہو

نہ پوچھ لا گا ہیئے بھی جام ہیے زہر یا امرت

تمہارے ہاتھ سے اندیشۂ نفع و ضرر کیا ہو

مروت سے ہو بیگانہ وفا سے دور ہو کوسوں

یہ سچ ہے نازنین ہو خوبصورت ہو مگر کیا ہو
شگوفے دیکھ کر مٹھی میں زر کو مسکراتے ہیں
کہ جب عمر اس قدر کوتاہ رکھتے ہیں تو زر کیا ہو
رہا کرتی ہے یہ حسرت مجھے زہد ریائی پر
خدا سے جو نہیں ڈرتا اسے بندہ کا ڈر کیا ہو
کہا میں نے کہ ظالم مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اوس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو
کہا میں نے کہ ہے سوز جگر اور اف نہیں کرتا
کہا اس کی اجازت ہی نہیں پھر نوحہ گر کیا ہو
کہا میں نے کہ دے اوس کو اجازت آہ کرنے کی
کہا اوس نے بھڑک اٹھے اگر سوز جگر کیا ہو
کہا میں نے کہ آنسو آنکھ کا لیکن نہیں تھمتا
کہا آنکھیں کوئی تلووں سے مل ڈالے اگر کیا ہو
کہا میں نے قدم پھر پڑے وہ صورت دکھاؤ
کیا منھ پھیر کر اتنا کسی کو دردسر کیا ہو
کہا میں نے اثر مطلق نہیں کیا سنگدل ہے تو
کہا جب دل ہو پتھر کا تو پتھر پہ اثر کیا ہو

کہا میں نے جو مر جائے تو کیا ہو سوچ تو دل میں
کہا نا عاقبت اندیش نے کچھ سوچ کر کیا ہو
کہا میں نے خبر بھی ہے کہ دی جاں اوس نے گھٹ گھٹ کر
کہا مر جائے چپکی سی تو پھر مجھ کو خبر کیا ہو

۱۴ ۱۲۴

مجھی کو کہہ رہے ہو سب کہ سرگرم فغاں کیوں ہو
کوئی اس سے نہیں کہتا کہ تم نامہرباں کیوں ہو
نہ کھینچو اے چارہ گر پیکان قاتل میرے سینے سے
لیں یوں دل سے دل باہم تو کوئی درمیاں کیوں ہو
سرائے دہر میں ٹھہرے تو پھر شکوہ شکایت کیا
جسے خون جگر کھانا ہو وہ مہماں کیوں ہو
یکایک پھیر لینا آنکھ کا بس قہر ڈھاتا ہے
اگر کہہ سن کے بگڑو بھی تو مرگ ناگہاں کیوں ہو
ملے گی داد کیا محشر میں ہم کو اس ستمگر سے
نہیں ہونا ہوا کچھ تو پھر شور و فغاں کیوں ہو
قیامت آج ہی آ جائے صور حشر پھنک جائے
شب غم میں سجے کیوں صبح کی نوبت اذاں کیوں ہو

جب اپنی خو یہ ٹھہرے منہ میں جو آئے سو کہہ جا

تو پھر کہنا کسی کا طبع نازک پر گراں کیوں ہو

اشارہ میں گلِ نرگس نے پوچھا اسکی آنکھوں سے

فدا میں تم پہ تم بیمار کیوں ہو ناتواں کیوں ہو

نہ دیوانوں کے منہ لگ تو نہ ایسی گت بنی ناصح

اڑیں دامن کے کیوں پرزے گریباں دھجیاں کیوں ہو

وہ میرا جستجو میں اس کی جانا بزمِ خوباں میں

اور اس کا بدگمانی سے یہ کہنا تم یہاں کیوں ہو

اسے بے مانگے ہی دینے کی عادت تو نے ڈالی ہے

تو شرمندہ کسی کا پھر گدائے آستاں کیوں ہو

سمجھ لے دہر کو جاتا ہوا سیلاب ہے ورنہ

حباب آسماں کے ساتھ موج کہکشاں کیوں ہو

خبر لو ایک رنگ آتا ہے اک جاتا ہے چہرہ کا

تلون گر نہ ہو تو تیوریوں میں موجِ چیں کیوں ہو

تڑپنا نیم بسمل ہو کے حیدر تھا مقدر میں

رکے ہیں جب ہی مجھ سے تو پھر خنجر رواں کیوں ہو

ملے ہیں نقش جو ہم بوریا نشینوں کو
وہ دستیاب نہیں شاہوں کے نگینوں کو

کیا ہے صاف دلوں کی جو دور بینوں کو
تو ساتھ پردوں میں دیکھا گئے حسینوں کو

ہزار طرح سے پہلو تہی وہ کرتا ہے
کہیں جگہ نہیں ملتی ہے ہم نشینوں کو

گلہ بھی اس کے تغافل کا ہو نہیں سکتا
غرور و ناز ہی زیبا ہے نازنینوں کو

چمن کی سیر مبارک ہو تجھ کو اے نرگس
کسے یہ تاب کہ دیکھا کرے حسینوں کو

جہاں جہاں مری فکر بلند کا ہے عمل
نہ آسمان سے بدلوں میں ان زمینوں کو

ہوش رہی نہیں دولت کی خاکساری میں
کہ اس زمین نے سر کا دیا دفینوں کو

بتا دیا ہے ہمیں ساقی ازل نے بھی
کہ اپنے رنگ میں تو کھینچ ہم نشینوں کو

نہ پوچھ باد صبا موسم خزاں کا ملال

بسر کیا ہے بری طرح ان مہینوں کو
چھپائیں چاند کو کیا خاک ڈال کر لے ظلم
بھلائیں دل کی کدورت سے مہ جبینوں کو

۱۸

۱۳۶

کیا شراب نے رنگین آبگینوں کو
تو رنگ دیا ترے ساعد نے آستینوں کو
ہوس مقابلہ کی اوس سے تھی حسینوں کو
صفیں الٹ گئیں الٹا جو آستینوں کو
خدا کرے نہ کبھی کو کسی کا دست نگر
کہ بار بار چڑھاتے ہیں آستینوں کو
تپاک یار سے کس طرح دیتے ہم تشبیہ
قبائے گل میں نہ دیکھا تھا آستینوں کو
جہاں سے اہل ہوس ہاتھ اٹھا نہیں سکتے
ہزار بار چڑھایا ہے آستینوں کو
کوئی غبار کے پردے میں ہو نہ دامن گیر
الٹ لے آئینہ پر وار آستینوں کو
[illegible] کرتے ہیں نازکی سے [illegible]

اس دشت سے گزر تو سبکبار ہی گزر
چھالوں آشنا پاؤں نہ دنیا کو دیکھکر
کیا پوچھتے ہو دشت پھولوں کو وہ گلستاں نہیں
مشکل پسند میری طبیعت ہے شوہیں

اس طرح چاہیے کہ کہیں نقشِ پا نہ ہو
گھر جس کو اپنا سمجھے ہو مہماں سرا نہ ہو
کیا چاندنی کا لطف جو وہ مہ لقا نہ ہو
جاتا ہوں اس طرف کہ جدھر راستا نہ ہو

حیراں ہوں میں دعا ہی کہ یہ کونسا نظم
کہتے ہیں مجھ کو دیکھ کے تیرا بُرا ہو

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

١٤

یادگارِ رفتگاں لکھنؤ
ہوں قدِ آدم غبارِ کاروانِ لکھنؤ
حسرت کہہ رہی ہے داستانِ لکھنؤ
رہ گیا ہے اب یہی رنگیں بیانِ لکھنؤ
گوشِ عبرت سے سنے کوئی مری فریاد ہے
بلبلِ خونیں نوائے بوستانِ لکھنؤ
میرے ہر آنسو میں اک آئینہ تصویر ہے
میرے ہر نالہ میں ہے طرزِ فغانِ لکھنؤ
ڈھونڈھتا ہے اب کسے لے کر چراغِ آفتاب
کیوں مٹایا اے فلک تو نے نشانِ لکھنؤ

لکھنؤ جن سے عبارت تھی ہوئے وہ ناپدید
ہے نشانِ لکھنؤ باقی نہ شانِ لکھنؤ
اب نظر آتا نہیں وہ مجمعِ اہلِ کمال
کھا گئے ان کو زمین و آسمانِ لکھنؤ
پہلے تھا اہلِ زباں کا دور اب گردش میں ہیں
چاہیئے تھی تیغِ اردو کو فسانِ لکھنؤ
مرثیہ گو کتنے یکتائے زمانہ تھے یہاں
کوئی تو اتنوں میں ہوتا نوحہ خوانِ لکھنؤ
یہ غبارِ ناتواں خاکسترِ پروانہ ہے
خاندان اپنا تھا شمعِ دودمانِ لکھنؤ
چلتا تھا جب گھٹنیوں اپنے یہاں طفلِ رضیع
سجدہ کرتے تھے اُسے گردن کشانِ لکھنؤ
عہدِ پیرانہ سری میں کیوں نہ شیریں ہو سخن
بچپنے میں ہم نے چوسی ہے زبانِ لکھنؤ
گلشنِ فردوس پر کیا ناز ہے رضواں تجھے
پوچھ اس کے دل سے جو ہے رتبہ دانِ لکھنؤ
بوئے اُنس آتی ہے حیدرؔ خاکِ مٹیا برج سے

جمع ہیں اک جا وطن آوارگان لکھنو

فغاں از آہ و زاری دل دیوانہ در پہلو
شب ما زندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو
دل من سوخت ناگاہ پرتوے از شمع رخسارش
فغاں کیں شعلہ افتادہ است بیباکانہ در پہلو
خوشم آید ز ساغر خندۂ سرشار بر رو یم
خوشم آید ز مینا گریہ مستانہ در پہلو
ز فور مستی من کرد برہم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشۂ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوۂ جانانہ در پہلو
خوشا عرفاں اگر از ماسوا پہلو تہی کردی
بہ بیں کز گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
ز دوم بیشمع بالیں آستینے در شب ہجراں
دلم می سوخت بہر بے تابی پروانہ در پہلو
بشمع قامت آں ترک حسن فتنہ زا باشد

کہ خود تیغش بلرزد چوں پر پروانہ در پہلو

تنم را زار کرد است آنچناں سودائے زلف او
نمایاں استخواں ہا گشتہ مثل شانہ در پہلو

بشر در انقلاب دہر گوئی در غلطاں است
بہر پہلو کہ غلطد دارد آب و دانہ در پہلو

ہمانا چارہ داغ دل از مرہم نمی آید
کہ دارم سینہ بر پہلو و آتش خانہ در پہلو

مثل شد در تناسب چشم و ابرویش چو در عالم
ز راہ شوق مسجد می کشد میخانہ در پہلو

دلم محو طلسمات جہاں من طالب صانع
ہوائے کعبہ در سر دارم و بتخانہ در پہلو

خوشا وقت قدح خواری کہ گردش میکند باہم
بہ بزمش ساغر و ہم سبحہ صد دانہ در پہلو

چہ طومار شکایتہا کہ بنوشتم باو آخر
کہ ہر یک لفظ دارد معنی بیگانہ در پہلو

چو گل با خار مینی جائے فریاد است اے حیدر
کہ دل سوزد لبش پر خندہ و بیگانہ در پہلو

حرف ہ

۱۳

کس لیے چھپتے ہیں یہ شمس و قمر دونوں ساتھ
کس کو یہ ڈھونڈتے ہیں برہنہ سر دونوں ساتھ

کیسی یارب یہ ہوا صبح شب وصل چلی
بجھ گیا دل مرا اور شمع سحر دونوں ساتھ

بعد میرے نہ رہا عشق کی منزل کا نشاں
مٹ گئے راہرو و راہ گذر دونوں ساتھ

اے جنوں دیکھ اوسی صحرا میں اکیلا ہوں میں
رہتے جس دشت میں ہیں خوف و خطر دونوں ساتھ

مجھ کو حیرت ہے شب عیش کی کوتاہی پر
یا خدا آئے تھے کیا شام و سحر دونوں ساتھ

اس نے پھیری نگہ ناز یہ معلوم ہوا
کھنچ گیا سینے سے تیر اور جگر دونوں ساتھ

غم کو دی دل نے جگہ دل کو جگہ پہلو نے
ایک گوشے میں کریں گے یہ بسر دونوں ساتھ

اس کو روکوں میں الٰہی کہ سنبھالوں اس کو
کہ تڑپنے لگے دل اور جگر دونوں ساتھ

ناز بڑھتا گیا بڑھتے گئے جوں جوں گیسو
بل کی لینے لگے اب زلف و کمر دونوں ساتھ

تجھ سے مطلب ہے نہیں دنیا[۱] و عقبیٰ سے غرض
تو نہیں جب تو اجڑ جائیں یہ گھر دونوں ساتھ

بات سنتا نہ کسی چاہنے والے کی کبھی
کان میں پھونک رہے ہیں یہ گہر دونوں ساتھ

آندھیاں آہ کی بھی اشک کا سیلاب بھی ہے
دیتے ہیں دل کی خرابی کی خبر دونوں ساتھ

کیا کہوں زہرہ و خورشید کا عالم اے نظمؔ
نکلے خلوت سے جو نہیں وقت سحر دونوں ساتھ

---

[۱] دنیا میں الف مقصورہ ہے لیکن اس کا متحرک کر لینا جائز ہے

۱۴۱ ——— ۱۱

یوں تو نہ تری جسم نہ ہیں زینہار ہاتھ — دینے کے اے کریم مگر ہیں ہزار ہاتھ

انگڑائیوں میں پھیلتے ہیں بار بار ہاتھ — شیشہ کی سمت بڑھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

ڈوبے ہیں ترک سعی سے افسوس تو یہ ہے — ساحل تھا ہاتھ بھر پہ لگاتے جو چار ہاتھ

آتی ہے جب نسیم تو کہتی ہے موج بحر — یوں آبرو سمیٹ اگر ہوں ہزار ہاتھ

درپے ہیں میرے قتل کے احباب اور میں — خوش ہوں کہ میرے خوں سے رنگیں ہیں یار ہاتھ

دامن کشاں چلی ہے بدن سے نکل کے روح — کھنچتے ہیں پھیلتے ہیں جو یوں بار بار ہاتھ

مٹتا نہیں نوشتۂ قسمت کسی طرح — پتھر سے سر کو پھوڑ کے زانو پہ مار ہاتھ

ساقی سنبھالنا کہ ہے لبریز جام مے — لغزش ہے میرے پاؤں میں اور رعشہ دار ہاتھ

مطرب سے پوچھ مسئلۂ جبر و اختیار — کیا تال سم پہ اٹھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

میں اور وہ ہوں علائق دنیا کے دام میں — میرا نہ ایک ہاتھ نہ اس کے ہزار ہاتھ

اے نظم وصل میں بھی رہا تو نہ چین سے
دل کو ہوا قرار تو ہے بے قرار ہاتھ

حرف ی

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات

۱۴۲ ——— ۱۰

جھگڑا پڑا ہوا ہے نکلنے میں جان کے — کچھ حوصلے ابھی ہیں اُسی امتحان کے

آئی بہار اور خفقانی جہان سے
جنگل میں پیرہن کے گئے خاک چھان کے

لا یعقلانہ طرز ہیں سارے جہان کے
کیسی شرارتیں و ہیں سے آسمان کے

کیا دیر انقلاب میں اب تھے جہان کے
نالے پہنچ گئے ہیں قریب آسمان کے

دکھلا دو منہ ذرا صف محشر میں آن کے
اوڑ جائیں ہوش آج بھی سارے جہان کے

چاہے تو دو جہان کو ڈبوے یہ طفل اشک
مٹھی میں ہیں یہ سات ورق آسمان کے

حیران ہوں گلہ جو کسی سے کروں تو کیا
جو دل کا حال ہے نہیں قابل بیان کے

پازیب تک پہنچ گئے تو حلقہائے زلف
قلابے مل گئے ہیں زمیں آسمان کے

ہے منتظم کہ ہجر میں رونا ہی آگیا
آنکھوں پہ لوں گا میں قدم اس مہمان کے

سمجھا چھوڑا لگا تھا میں دل سے اٹھا کے ہاتھ
دل ہاتھ دھو کے بیٹھے پڑا میری جان کے

گوندا یہ کہہ رہا ہے کہ ہے فوج گل قریب
کہسار تک پہنچ گئے ہاتھی نشان کے

شیریں ہیں تیری گالیاں بھی حرف تلخ
اوصاف کس زبان سے ہوں اس زبان کے

پایا تجھے نہ عالم اجسام میں کہیں
چھان آئی فکر سات طبق آسمان کے

اب تک میں سن رہا ہوں صدائے الست کو
گویا حجاب قدس یہ پردے ہیں کان کے

احسان سر پہ لے تو کسی باوقار کا
ٹھہرے اگر تو سایہ میں اونچی مکان کے

آنکھوں کے سامنے سے گیا ہے وہ قافلہ
دیکھے جہاں ہیں لوگ نہ اس آن بان کے

بہتر ہی تو بھی اے نفس واپسیں نہ آ
کب تک اٹھاؤں ضعف میں صدمے تکان کے

سوتے میں چشم غول کو سمجھا چراغ بام
مارا پڑا میں دھیان میں تیرے مکان کے

اے دودِ آہ ہو گئی رسوائیوں کی حد — جھنڈی پہ چڑھ گئی یہ ہاتھی نشان کے

اے نظمِ بزمِ عیش یہ مقتل کا ہو گماں
چھریاں یہ چل رہی ہیں کہ نقرئی اذان کے

۲۱

روکے ہوئے ہے بن کے حصارِ آسماں مجھے — ذوقِ وصال کھینچ کے لایا کہاں مجھے

لے تو چلا ہے توسنِ عمرِ رواں مجھے — اس کی خبر نہیں کہ گرا دے کہاں مجھے

ہوش و خرد ملے مجھے تاب و تواں مجھے — اس کے عوض اٹھانا ہے بارِ گراں مجھے

ہوں قلزمِ فنا میں سہارے پہ سانس کے — دیکھ اے حباب خوب ملا بادباں مجھے

جب سے کنارہ میں نے کیا سرو کی طرح — یکساں ہے اس چمن کی بہار و خزاں مجھے

کچھ کہہ رہی تھی شہرِ خموشاں کی خامشی — کوئی سنے تو یاد ہے اک داستاں مجھے

جلدی نہ کر تعلقِ دنیا ہے سدِّ راہ — اے موت توڑنا ہے یہ بندِ گراں مجھے

اچھا اگر نہیں شنوائی نہیں سہی — اس کا علاج کیا کہ ہے ذوقِ فغاں مجھے

کہتا ہے اوٹھتے بیٹھتے واماندوں کا غبار — کیوں ٹھوکروں میں لے نہ گیا کارواں مجھے

خود کو سنبھالتا کہ میں دل کو سنبھالتا — اک بیخودی تھی ہوش تھا یارب کہاں مجھے

دیکھا شعارِ اہلِ ورع سمعہ و ریا — آئی پسند صحبتِ دیرِ مغاں مجھے

سن لے یہ کہہ رہا ہے زمانہ شباب کا — وقتِ عزیز میں ہوں نہ کر رائگاں مجھے

بھولا ہوا ہوں عہد کو صبحِ الست کے — پہلا سبق ہوا نہیں اب تک رواں مجھے

ناوک لگا رہا ہے اس انداز سے کوئی
لہرا رہی ہے موجِ تہِ رنگ کماں مجھے

سر میں سفیدی آ گئی باقی ہے پھر بھی جوش
پچھلے کی چاندنی میں ہیں خوابیاں مجھے

کچھ کم نہ تھا بہار کا غم اس پہ یہ ستم
رہ رہ کے چھیڑ جاتی ہے بادِ خزاں مجھے

آفاتِ دہر سے تھا ہراساں میں کس قدر
دی مرگِ ناگہاں نے نویدِ اماں مجھے

زحمت بغیر خلق میں راحت نہیں نصیب
تنکے چننے میں جب تھے ملا آشیاں مجھے

خواہش کی پیروی سے ہے جہنم کا سامنا
گلخن میں سمجھی ہوس گلستاں مجھے

باہم جو اتحاد ہے پاتا نہیں رقیب
اس کے وہاں آ دیئے تو میری یہاں مجھے

اے نظم کوہ و دشت میں تکرار ہوں اب
بانگِ جرس ہوں چھوڑ چلا کارواں مجھے

۱۴۳ — ۲۲

گذری نسیمِ باغ کو شاداں کئے ہوئے
رہ جاتے ہیں جہاں میں احساں کئے ہوئے

رخ ہے عدم کا عمرِ گریزاں کئے ہوئے
ہستی کو گردِ جنبشِ داماں کئے ہوئے

تھی صبح ظلمتِ شبِ غم سے ڈری ہوئی
آئی چراغ کو تہِ داماں کئے ہوئے

کیا جلد جا رہا ہے زمانہ نشاط کا
اسپِ عناں گسستہ کو جولاں کئے ہوئے

آیا تھا جوشِ لالہ و گل کی طرح شباب
جاتا ہے خونِ حسرت و ارماں کئے ہوئے

دشمن سے رنج پہنچے تھے وہ سب بھلا دیئے
بھولا نہیں میں دوست کے احساں کئے ہوئے

میدانِ بازپرس میں دیوانگانِ عشق
بیٹھے ہیں چاک دفترِ عصیاں کئے ہوئے

اوتنا ہی شکر نعمت و راحت میں چاہیے

جتنی شراب محفل عشرت میں چاہیے

اس بات کا خیال محبت میں چاہیے

برگ حنا دو رنگ ہے اس سے ہو پائے مال

میکش ہو نہ مست ہو تو شاہد پرست ہو

نکلا جو کیم قدس رگ جاں رہے متصل

پہلو سے دل نکال کے ہاتھوں نے اپنے [illegible]

[illegible] کا عمر [illegible] صبح [illegible]

[illegible]

[illegible] روک میں لا کے دوں [illegible]

حسرت سہی امید سہی آرزو سہی

اس وطن نہیں سہی یاد وطن سہی

آنکھوں نہیں پڑ کے کہتی ہے یہ خاک [illegible]

اپنی ہی جب نظر میں سماتے نہیں ہیں ہم

احباب پر نہ لاش اٹھانے کا بار ہو

ملتے دے تو گالیاں دی ہیں میں شرم کیا

جتنا کہ صبر رنج و مصیبت میں چاہیے

اوتنا ہی خوش دل غم فرقت میں چاہیے

لینے جو چاہیے تو حقیقت میں چاہیے

بس ایک رنگ معنی و صورت میں چاہیے

اس سعی و ریا نہ عبادت میں چاہیے

ایسی طناب پردہ قدرت میں چاہیے

ایسا حضور قلب عبادت میں چاہیے

کیا دوں گر کفن مجھے خلعت میں چاہیے

کچھ فرق گاہوارہ و تربت میں چاہیے

جو چاہیے نہیں وہ اس آفت میں چاہیے

مونس کوئی تو عالم وحشت میں چاہیے

کوئی تو ساتھ وادی غربت میں چاہیے

سرمہ ضرور دیدۂ عبرت میں چاہیے

اب کون سی ہے بات جو ذلت میں چاہیے

میری لحد بھی گوشۂ عزلت میں چاہیے

کچھ تو بھلا نمک بھی جراحت میں چاہیے

سکتے ہیں کبھی نہ آئینہ دکھلائیں چارہ گر
اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی

دل کو سنبھالتی تھی پہلے ہمیں اور اب
خود کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہی

مانند ابر کو کہ سراپا بخار ہیں
مانند برق نبض میں سرعت نہیں رہی

تلووں کو شوق خارِ مغیلاں نہیں رہا
سر میں ہوائے وادیِ وحشت نہیں رہی

وہ انتظارِ وصل کی شب کا گذر گیا
وہ بیقراری شبِ فرقت نہیں رہی

ماتم ہی ہم شباب کا کرتے تمام عمر
مجبور ہیں کہ ہاتھ میں طاقت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ جنت کی تھی بہار
لیکن اب اس چمن میں طراوت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر شیریں بہت تھی زیست
لیکن اب اس شکر میں حلاوت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ تھی رخ پہ آب و تاب
لیکن اب آئینہ میں وہ طلعت نہیں رہی

گفتار میں مزہ ہے نہ رفتار میں ادا
باقی وہ بول چال میں لذت نہیں رہی

اب یہ فروتنی ہے تواضع ہے انکسار
وہ تمکنت وہ شان وہ شوکت نہیں رہی

لبریز ہو چکا ہے جو پیمانہ عمر کا
جام شراب ناب پہ رغبت نہیں رہی

جاتا رہا شباب رہا غم شباب کا
باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی

بالیں پہ آ کے ناز سے کہتی ہے یہ اجل
کیوں اب تو سچ کہو کوئی حسرت نہیں رہی

بولی یہ روح قالبِ خاکی کو چھوڑ کر
دامن پہ گردِ وادیِ غربت نہیں رہی

ان ابروؤں سے راہ حقیقت ملی مجھے
اب قوس کمان کی مسافت نہیں رہی

خلوت سے چھپ رہا تھا جو پردۂ خودی کو چھوڑ
خلوت میں اور [illegible] نہیں رہی

کیا خوف کاتبانِ عمل کا بہار میں
ساقی وہ رت بدل گئی پھر بدل گئے

جب دل پہ رکھ لیا نہ رکیں گے کسی طرح
پھر کوہسار سامنے آئے تو ٹل گئے

رہتے تھے جو سپید خورنق سے قصر میں
لے کر لحد میں ساتھ نہ اونچے محل گئے

عمریں جنہوں نے گوشۂ عزلت میں کاٹ دیں
بیٹھے ہی بیٹھے وہ تو بڑی چال چل گئے

کس نے یہ کہہ دیا مرے ماتم میں رو دیئے
نرگس کے پھول دشت لگا کر بدل گئے

منقل ہے اہلِ دید کا ذوقِ زیرِ بام
دیکھی جو اک جھلک تو کلیجے مسل گئے

اے نظم عشق اور ہوس میں یہ فرق ہے
بیمار میرے ساتھ کے اکثر سنبھل گئے

۴۹ ——— ۱۷

دل اس کے سامنے ہی وہ ہو دل کے سامنے
پردہ جو ہو تو آنکھ کے اک تل کے سامنے

بیٹھے ہیں ہم حسینوں کی محفل کے سامنے
کوئی تو آئے کاکششِ دل کے سامنے

ٹھہرا جنازہ گور کی منزل کے سامنے
کشتی بس اب پہنچ گئی ساحل کے سامنے

ہو گی مجھی پہ تیغ لگانے کی ابتدا
پہلے پہل چلا ہوں میں قاتل کے سامنے

اچھے رہے وہ راہِ وفا میں جو مر مٹے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں منزل کے سامنے

غنچہ کا دل بھی آہ سے خالی نہ تھا مگر
سنتا ہے کون شورِ عنادل کے سامنے

تیغ نگاہ ایک خریدار سیکڑوں
چھریاں چلیں گی دیکھنا قاتل کے سامنے

ہم خاک ہو کے بھی نہ رکے راہِ شوق میں
آ پہنچے اڑ کے منزل کے سامنے

دیکھا رگ سحاب میں بجلی کا اضطراب
اک نبض ناتواں تپش دل کے سامنے

تیر بلا و فا کا پاس رہے کشتگان عشق
تیوری چڑھے نہ خنجر قاتل کے سامنے

قاتل کے رخ گیا ہے لبوں تک پہنچ کے دم
الٹی چلی نہ سانس بھی بسمل کے سامنے

کیسی نگاہ یاس نے تصویر کھینچ لی
قاتل کا منہ اتر گیا بسمل کے سامنے

بھولے ہوئے کو یاد دلانے سے فائدہ
کیوں دل کا نام لیتے ہو بیدل کے سامنے

اے ساربان ناقۂ سلمیٰ ہوش باش
اٹھ اٹھ کے خاک آتی ہے محمل کے سامنے

میری نظر اٹھی یہ جو نکلوا دیا تجھے
گستاخیاں بھری ہوئی محفل کے سامنے

ابرو کا حسن دیکھتے ہی چھپ گیا ہلال
ٹھہرا گیا نہ مہ مقابل کے سامنے

اے نظم تجھ سے پوچھے دل قیس کی خبر
دیکھا تھا تو نے کسی محمل کے سامنے

۱۵۰ ۲۲

نشہ میں سوجھتی ہے مجھے دور دور کی
ندی وہ سامنے ہے شراب طہور کی

خدمت ہی شہد باقی گلشن طیور کی
از بر میں عندلیب کو سطریں زبور کی

ہنگامہ وعظ عشوہ گری بے سبب نہیں
واعظ ترے خیال میں چھپی ہے حور کی

ان زاہدان خشک کو حصہ اگر ملا
مٹی ہوئی خراب شراب طہور کی

میدان حشر میں مرے نالوں کے سامنے
بیٹھی ہوئی نکلتی ہے آواز صور کی

نگینہ ہوا یہ مثل سلیماں ہوا تو کیا
ملتے ہیں ذرہ ذرہ چھپاؤ نہ بال طیور کی

اے نظم دیکھ لیجئے گا ہم جو کہتے ہیں
پھر اس سے بات آپ کی اور ضرور کی

۱۵۱ — ۱۹

دل میں شرارت اُنکی سمائی ہوئی سی ہے — کچھ آگ دشمنوں کی لگائی ہوئی سی ہے
صورت عتاب کی بنائی ہوئی سی ہے — او حیلہ جو ہنسی تجھے آئی ہوئی سی ہے
بادِ صبا یہ چال اڑائی ہوئی سی ہے — ساری ادا کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے
ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا — جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے
میں کس طرح فلک کے ستم کا گلہ کروں — یہ چال تو کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے
شاہان سرفراز کا اتنا تو ہے نشان — کچھ گرد آسمان تک چھائی ہوئی سی ہے
دلکش کچھ اس طرح کی صدائے الست تھی — کانوں میں آج تک جو سمائی ہوئی سی ہے
منزل اٹھے بیٹھے کا کھو لیتے ہیں ہم — بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے
پہلے تو اضطراب نہ تھا دل کو اس قدر — بجلی یہ آسماں کی گرائی ہوئی سی ہے
رنگیں ہی میرے قتل سے دامن بھی یار کا — تلوار بھی لہو میں نہائی ہوئی سی ہے
باقی نہ اُنکا کُشتۂ شمشیرِ ناز ہے — افعی کے زہر میں یہ بجھائی ہوئی سی ہے
آمد سے ظلمت شبِ ہجراں کی دن ہی آج — تاریکی آفتاب پہ چھائی ہوئی سی ہے
جلسہ تو ہوگا عید میں دورِ شراب کا — سرخی ابھی سے چہرہ پہ چھائی ہوئی سی ہے
اس بت کی دید کو نظر پاک ہیں ہے شرط — اور آنکھ آئینہ کی لگائی ہوئی سی ہے

نالے اُسی طرف ہیں رواں آہ اُسی طرف — جانِ حزیں فلک کی ستائی ہوئی سی ہے

زلفیں بھی حلقہ حلقہ ہیں کاکل بھی پیچ پیچ — آنکھوں میں وہ پری دل میں سمائی ہوئی سی ہے

فصلِ بہار آ گئی اک جام پیتے ہی — ساقی گھٹا کچھ آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے

سمجھو اسے بنے ہوئے شاعر کا ہے کلام — جس شعر میں کہ بات بنائی ہوئی سی ہے

آساں ہے نظمِ ترکِ ملاقات خلق سے
لیکن پری یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

۱۰ ——— ۱۵۲

تنہا نہیں ہوں گر دلِ دیوانہ ساتھ ہے — وہ ہر رہ گرد ہوں کہ پریخانہ ساتھ ہے

ہنگامہ اک پری کی سواری کا دیکھنا — کیا دھوم ہے کہ سیکڑوں دیوانہ ساتھ ہے

دل میں ہیں لاکھ طرح کے حیلے بھرے ہوئے — پھر مشورہ کو آئینہ و شانہ ساتھ ہے

روزِ سیہ میں ساتھ کوئی دے تو جانیے — جب تک فروغِ شمع ہے پروانہ ساتھ ہے

دنیا نہیں ہے ساتھی تہی دست کا کوئی — جب تک کہ مے ہے شیشہ میں پیمانہ ساتھ ہے

سیکھا ہوں میکدہ میں طریقِ فروتنی — جب تک کہ سر ہے سجدۂ شکرانہ ساتھ ہے

جو بے بصر ہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں دور دور — اور ہر قدم پہ جلوۂ جانانہ ساتھ ہے

کیا خوف ہو ہمیں زنِ دنیا کے مکر کا — اپنی مدد کو ہمتِ مردانہ ساتھ ہے

غم کی کتاب ہے دلِ صد پارہ کم نہیں — جس بزم میں گئے ہیں افسانہ ساتھ ہے

مانندِ گردباد ہوں خانہ بدوش میں — صحرا میں ہوں مگر مرا کاشانہ ساتھ ہے

باندھے تھے ان کے ہاتھ لگا کر حنا کبھی
فریاد و آہ سے نہ مرا دل بھرا کبھی
تھی ہم سے آپ کے نہ ملاقات کیا کبھی
عالم کو قتل کیجئے ترچھی نگاہ سے
کعبہ میں بتکدہ میں گیا خستہ ہو گئی
اب اشک گرم آتے ہیں ساتھ آہ سرد کے
دیکھا تھا اک نظر کہ چلی سو نگہ کے تیر
تھا اوسکو میری پیچ میں دریا کے آئینہ
گرداب میں جب آ گئی کشتی تو سمجھے ہم
اس بزم میں جلائے گئے ہم شمع کی طرح
گویا کہ زخم تھا میں دل روزگار کا
بے وجہ ہو کسی کی برائی میں جو کوئی
زانو پہ مار ہاتھ کو پتھر سے پھوڑ سر
ظلمات میں تو جائے اگر آئے تجھے خضر
چشمے کبھی بہائے ہیں [illegible]

کھولے ہیں تو نے چھیڑ چھیڑ کے بند قبا کبھی
فوراً اٹھائے درد جو میٹھا لگا کبھی
یوں پھر گئے کہ جیسے نہ تھے آشنا کبھی
یہ ہے وہ تیر جو نہیں کرتا خطا کبھی
زاہد یہاں قبول نہ ہوتی دعا کبھی
ایسی تھی برخلاف نہ آب و ہوا کبھی
کہتا رہا کہ اب سے نہ ہوگی خطا کبھی
اوس پار اس طرف کی نہ پہنچی صدا کبھی
ساحل پہ یاد ہی نہیں آیا خدا کبھی
نکلا زبان سے نہ برا یا بھلا کبھی
رویا کبھی تو حال پر اپنے ہنسا کبھی
اس کا کبھی اس جہاں میں نہ ہوگا بھلا کبھی
مٹتا نہیں نصیب کا غافل لکھا کبھی
کوچہ میں زلف کے نہ ملے گا پتا کبھی
میرا قلم عصا تھا کبھی اژدہا کبھی

کیا ظرفِ عاریت نفسِ مستعار ہے
جس کی بقا کا آمد و شد پر مدار ہے

چرخِ کوکب ایک خود شرار ہے
ہستی سے جو کتابہ عدم بے قرار ہے

چھوڑے نہ راستی کا کبھی راستہ بشر
ہونے دے گر ہمارا فلک کج مدار ہے

پتھر میں گھر بنایا ہے تو نے جو اے شرار
آخر بنائے گھر بھی کچھ پائدار ہے

ہے یہ صدا شکست میں جام حباب کی
ظرفِ طلسم پہ نفسِ مستعار ہے

ہونے کو اب ہے چاک گریباں کہ آ رہی
المدد زیر فشانیٔ بادِ بہار ہے

فکر رسائی میں قدر انداز یاں عجیب
جو طائرِ خیال ہے اس کا شکار ہے

۵۵ —————— ۱۱

نظروں سے تو نہاں وہ مثالِ نظر رہے
آنکھوں میں پتلیوں کی طرح جلوہ گر رہے

ہے آنکھ وہ کہ عیب پہ اپنی نظر رہے
وہ ہے قطرہ کہ اشکِ ندامت سے تر رہے

وہ دن ہے کہ ادھر میں آ کر اتر رہے
کہنے کو بس کہیں گے یہی عمر بھر رہے

کہتی ہے اے صبا یہی آہستگی کی چال
تو جا ہی سے باغ میں دم بھر ٹھہر رہے

آیا نہ کچھ جواب تو قاصد پھر آ کوئی
خط لے کے جو گئے تھے وہیں جا کے مر رہے

کیسا خیالِ ضبط نے ہو اکیا تجھے
نوکِ مژہ پہ اشک کے قطرے ٹھہر رہے

دم بھی روانہ ہو اگر افشائے راز ہو
اس کاروانِ آہ میں ہم ہم سفر رہے

پڑھ لو لکھا ہے صاف خطِ تقدیر پاس میں
ہم ہر کہیں شوق کے سینہ سپر رہے

دن نے کبھی نہ ہو جائے پال بھی
اس پر کسی حسین کے نہ نظر رہے

خورشید پہ یہ خندۂ دنداں نما ہوا | شبنم کے اشک گل پہ جو وقتِ سحر رہے

اے نظم ساتھ نبھ نہ سکا اہلِ ذوق کا
جب وہ قدم اٹھا کے چلے ہم ٹھہر رہے

۱۵۶ —————— ۱۱

میں ہی رہا نہ اے شبِ عشرت نہ تو رہی | رونے کو لاش پر جو رہی آرزو رہی
وقتِ سحر نہ بزمِ طرب رو برو رہی | اک میں گرفتہ دل رہا اک آرزو رہی
سمجھو گے تم ثبات نہ مانوں گا میں کبھی | میرے تمہارے حشر پہ اب گفتگو رہی
خلوت میں آئینے نے بھی دیکھا ترا جمال | او بیوفا رہی تو مجھے آرزو رہی
جھگڑا تمام ہو گیا پہلی نگاہ میں | اچھا ہوا کہ جان گئی آبرو رہی
دل میں مرے ہوا و ہوس کی جگہ نہ تھی | ناخواندہ میہماں کی طرح آرزو رہی
حیرت سے اپنی درسِ خموشی ملا مجھے | طوطی کو آئینے سے اگر گفتگو رہی
عالم میں اے اجل نہ کوئی تھا رفیقِ یار | میں تیرے ساتھ اور میرے ساتھ تو رہی
نکلیگی تن سے روح خدا جانے کس طرح | گر وقتِ نزع کشمکشِ آرزو رہی
بخشش کا حکم ہو گیا رحم اس کو آ گیا | جب تھوڑی دیر لاش مری قبلہ رو رہی

بیجا نہ تھی یہ آمد و رفتِ نفس بھی نظم
ہر ایک ذی حیات کو کچھ جستجو رہی

۱۵۷ —————— مفعول فاعلاتن ۲ بار —————— ۱۵

خاموش ہیں فغاں سے لب آشنا نہیں ہے
اوس کارواں میں ہیں ہم جس میں درا نہیں ہے
کچھ آرزو نہیں ہے کچھ التجا نہیں ہے
پائے طلب نہیں ہے دستِ دعا نہیں ہے
بندہ ہے رندِ مشرب کچھ پارسا نہیں ہے
پھولوں میں بو رہے کے بوئے ریا نہیں ہے
پھینکی کمند کیونکر قمری کے آشیاں پر
سروِ چمن کا طرہ اتنا رسا نہیں ہے
ہے گلبنِ شگفتہ عہدِ شباب لیکن
رنگِ بقا نہیں ہے بوئے وفا نہیں ہے
نکلے جو میرے دل سے میری نہیں تمنا
پیدا اثر ہو جس میں میری دعا نہیں ہے
کیوں تیری رہگذر میں بیمار سر نہ پٹکیں
تعویذِ دردِ سر ہے یہ نقشِ پا نہیں ہے
بلبل کو عشقِ گل میں کیا خاک لطف ہوگا
تیرِ نگہ نہیں ہے تیغِ ادا نہیں ہے
اہلِ دول نہ اتنے پھیلائیں پاؤں اپنے

یہ کارواں سرا ہے دولت سرا نہیں ہے

کیا جانے درد ہجراں کیا جانے آہ سوزاں
ناصح مری طرح سے تو مبتلا نہیں ہے

یہ دل ودیعتِ حق اور معرفت سے خالی
آئینہ تو ہے لیکن اس میں جلا نہیں ہے

جاتی ہے غمزدوں کی فریاد اوپر اوپر
گنبد میں آسماں کے شاید صدا نہیں ہے

حیرت کا میری باعث جلوہ ہے خود تمہارا
تم آئینہ سے پوچھو میری خطا نہیں ہے

کہنے سے تیرے ناصح چھوڑوں میں ہرزہ گردی
تیری طرح سے میرا کچھ سر پھرا نہیں ہے

تسلیم آج ڈھونڈنے کو اس کے چلا تھا گھر سے
کھویا گیا خود ایسا جس کا پتا نہیں ہے

۱۵۸ — مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات — ۱۳

بسانِ نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے
ہے آشنا وہ جو کہنے پہ آشنا کے چلے

فضائے دہر میں ہم مثلِ برق آ کے چلے
تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے

روا روی میں یہاں ہم سن لو قافلہ والو
کہ جس کو ساتھ ہو دنیا قدم اٹھا کے چلے

گدائے کوچۂ محبوب را ہمی زیبد
شکستِ طرف کلہ شوکتِ جہانداری

خضر بہ حالتِ تنہائیت و غم سوزد
چہ لطفِ زیست کہ اندوہِ جاوداں داری

بنال نظم کہ ایں بزم میگسارانست
شراب دردِ تو در شیشۂ فغاں داری

١٦٠ ——— ١٨

کتاں کی طرح جو نازک جگر نہیں رکھتے
وہ ذوقِ جلوۂ حسنِ قمر نہیں رکھتے

نہ دے سکیں گے مرا ساتھ رہروانِ طریق
وہ یوں قدم دمِ شمشیر پر نہیں رکھتے

سفینہ اپنا ہی صبر و رضا کے ساحل پر
امید و بیم کے طوفاں کا ڈر نہیں رکھتے

یہ راستی پہ تو واضح جو سرو و بید میں ہے
شجر ہیں اور بھی ایسا ثمر نہیں رکھتے

مریضِ غم کو خوشی کیا جو ہے سحر نزدیک
کہ چارہ گر تو امیدِ سحر نہیں رکھتے

اوڑا دے اے قدر افگن لگا کے تیر کوئی
ہوس ہے اوڑنے کی اور بال و پر نہیں رکھتے

وہ لوگ جو ہیں رہِ مستقیم کے سالک
قدم اودھر نہیں رکھتے اودھر نہیں رکھتے

فروتنی نے کیا سرکشی کو یوں پامال
کہ جانتے ہیں کہ ہم تن پہ سر نہیں رکھتے

فلک نے دہ ہیں شبِ غم کے جاگنے والے
سوائے رنگِ پریدہ سحر نہیں رکھتے

عزیزِ خلق وہی خوش نصیب ہیں جو لوگ
سرِ غرور و دلِ کینہ ور نہیں رکھتے

ستارہ ریزیِ شامِ طرب میں محو ہیں جو
نفس گدازیِ یادِ سحر نہیں رکھتے

ہمیشہ لالہ کے مانند لب ہے پر خندہ
مگر شکایتِ داغِ جگر نہیں رکھتے

دماغ اپنا بھی ہے آسمان پر لیکن
فلک کی طرح سے دوران سر نہیں رکھتے

گلوں کو بھی دل و دعویٰ ہے نغمہ سنجی کا
زبان حال کی بلبل خبر نہیں رکھتے

دکھاؤنگا اونھیں میں چاک چاک جیب شکیب
کہ زعم ہے نگہ پردہ در نہیں رکھتے

فغاں ہیں بلبل شیدا کے نشتر ہوں تو کیا
جو کوچہ رگ گل میں گذر نہیں رکھتے

فروغ بخش ہے چشم محبت احباب
شعاع مہر سے تار نظر نہیں رکھتے

اونھیں ہے حلقہ کا نظم جز غم نوشتن میں
خبر کچھ اپنی بھی جو بے خبر نہیں رکھتے

۶۲ ۱۷

جہان کس کا ہے عمر گریزپا کس کی
یہ چلتی چھاؤں ہے ہوتی ہے آشنا کس کی

نگاہ اس سے لڑی دل کا غیر حال ہوا
گناہ کس نے کیا آگئی قضا کس کی

وفور رشک سے محفل میں کہہ نہیں سکتا
لگا رہی ہے مجھے برچھیاں ادا کس کی

عدو ہے در پے جاں دوست در پے دل ہے
بیان کس سے کروں جا کے میں جفا کس کی

ٹپک پڑے ہیں جو مجنوں کے ذکر پر آنسو
یہ سچ بتا تجھے یاد آگئی وفا کس کی

مجھی پہ رکھتے ہیں الزام میرے ہی غمخوار
بر لگے اسے طاقت ہے یہ بھلا کس کی

کسی طرح نہیں جاتا خیال زلف و کمر
یہ کیا ہوا کہ مرے پیچھے پڑی بلا کس کی

وہ آ کھڑا ہوا بالین پہ اور میں اوٹھ بیٹھا
کدھر کا ضعف کہاں کا مرض دوا کس کی

قدم پہ اس کے گرا سامنے ہی ناصح کے
لحاظ کیسا کہاں کا ادب حیا کس کی

ہوا بہشت کی آتی ہے جب تو ساغر مئی
چھلک کے جام شراب طہور ہوتا ہے

دل اپنا آپ سے دیتا نہیں کسی کو کوئی
یہ ظلم ہوتا ہے اور بے قصور ہوتا ہے

چھپیں نہ ریزہ مینا کی طرح کیوں شیشۂ گل
کوئی بھی نشہ میں اس طرح چور ہوتا ہے

قیام کب ہے جو حاصل بھی ہو فراوانی
ہوا پہ سایۂ بالِ طیور ہوتا ہے

سرائے دہر میں ہے کون آشنا کس کا
کہ صبح و شام ورود و صدور ہوتا ہے

فروتنی میں کچھ ایسی ادا نکلتی ہے
کہ انکسار پہ اپنے غرور ہوتا ہے

کیا نشیب و فراز جہاں کو جب ہموار
نہ دل میں رنج نہ پیدا سرور ہوتا ہے

نہیں علاج منافق کی روسیاہی کا
جو دل ہو صاف تو چہرے پہ نور ہوتا ہے

اوسے کرم پہ ہے اصرار ہم کو عصیاں پہ
اودھر سے عفو ادھر سے قصور ہوتا ہے

کیا ہے اوس نے ہر اک سے وصال کا وعدہ
اس اشتیاق میں مرنا ضرور ہوتا ہے

سراب ہے جسے سمجھے ہوئے ہوں میں دریا
کہ جتنا بڑھتا ہوں اتنا ہی دور ہوتا ہے

جنوں نے کھینچا ہے دامن مرا اودھر سے ظلم
ہر ایک خار جہاں نخل طور ہوتا ہے

١٩٤

کہے سے ہو ذرا پاس آ کے بیٹھ گئے
نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے اٹھ گئے

کچھ اس ادا سے چلا ہے تو اوٹھ کے تصل
کہ دل بھی ساتھ ترے نقش پا کے بیٹھ گئے

نگاہ یاس مری کام کر گئی اپنا
رولا کے اٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

ہو گئے کیا کیا ستم اب تو نہیں کچھ یاد بھی
دل تھا پہلو میں تو کرتے تھے کبھی فریاد بھی
میں تو صیدِ تازہ تھا جو کا مگر صیاد بھی
پلکیں نا بکی تھیں تو ہی دیتا لبِ فریاد بھی
تکیہ رکھتے ہیں خدا پر ہیں فقیر آزاد بھی
کم نہیں کملی سے ہم کو سایۂ شمشاد بھی
دل فریبی پر تلے ہیں سرو بھی شمشاد بھی
جاں ستانی پر کمر باندھے ہوئے صیاد بھی
میں بھی اس گلشن میں ہوں اور خانۂ صیاد بھی
نالہ وہ کھینچوں کہ جس میں برق بھی ہو باد بھی
غم نہیں اس کا اگر میں ہو گیا برباد بھی
دل تو ہے پہلو میں اور دل میں تمہاری یاد بھی
یاد ہے شیون بھی مجھ کو نالہ بھی فریاد بھی
آپ کو مرغوب کیا ہے کچھ تو ہو ارشاد بھی
اب تو قائل ہے وفا کا وہ ستم ایجاد بھی
ظلم بھی ہے ستم بھی ہے داد بھی بیداد بھی

کم نگاہی اس قدر بے التفاقی اس قدر
اک نگہ پر ہم بکے بھی ہو گئے آزاد بھی

آنکھیں پھوڑیں اوس کی جو منکر ترے جلوہ کا ہو
دیکھتا ہے یہ کرشمے کو ریا درزاد بھی

رشکِ یکتائی کہاں تک تا کجا قہر و غضب
خاک میں تو مل چکے نمرود بھی شداد بھی

دیکھنا اس خوابِ نوشیں کو نہ چھیڑے ہم ذرا
شور ِیا تم بھی رہا شورِ مبارک باد بھی

کی سوادِ شہرِ خاموشاں نے کچھ ایسی کشش
منزلوں پیچھے رہی مجھ سے مری فریاد بھی

سایۂ گلبن میں بلبل کو اترتے دیکھ کر
چال پر چھائیں کی سی چلنے لگا صیاد بھی

دل سے بھاگی ہے وفا اہلِ فنا کی اسقدر
جان دے کر ہو لِلوں در د میر فرہاد بھی

ایک تو منزل کٹھن ہے اور پھر ہر گام پر
حادثہ پر حادثہ افتاد پر افتاد بھی

قطعہ

حشر میں ظالم نے یہ کہہ کر گلا گھونٹا مرا
ایک تو اپنا قصور اور اس پہ یہ فریاد بھی

میں تو اب چپ ہوں مگر اس خونِ ناحق کا گواہ
دامنِ جلاد بھی ہے خنجرِ فولاد بھی

لوحِ دل سے نقشِ ہستی کو مٹا کر بارہا
توڑ ڈالا ہے طلسمِ عالمِ ایجاد بھی

ے اشک و آہ پر جو باندھنوں باندھے گئے
یوں نہ اٹھا تھا کبھی طوفانِ ابر و باد بھی

سیج پر پھولوں کی اس نے کروٹیں لیں رات بھر
گڑھ گیا تھا ہار میں شاید دلِ ناشاد بھی

اس بوٹا سے قد پر کیوں نہ ہو زیبا تجھے
جھومتے ہیں سرو بھی اٹھلاتی ہیں شمشاد بھی

غزل خوانی نہیں ای نظم ہے صورتگری
باربد بھی محوِ حیرت ہو گیا بہزاد بھی

١٦

پھر ہوں میں جب سی جوشِ عشق میرے دل میں ہے
زور و شورِ موج کا پیدا اثر ساحل میں ہے

ابر تر ہے یا کہ ہے خمخانۂ کیف بہار
شاخ گل ہے یا کہ پیمانۂ کف ساحل میں ہے
تھی لہو کی چھینٹ باقی میرے جسم زار میں
وہ بھی کچھ تلوار میں کچھ دامن قاتل میں ہے
مر مٹے دریا تلک آ آ کے لاکھوں تشنہ لب
استخوانوں کی صدا خمیازۂ ساحل میں ہے
جان دینے کا مزہ اہل وفا سے پوچھئے
مر چکے ہیں پھر بھی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
دیدۂ بیدار میں ہے ہو کا عالم ہر طرف
بزم ہستی خواب ہے اور دیدۂ غافل میں ہے
میں کسی کے منہ پہ رکھوں بات یہ عادت نہیں
ورنہ ہے میری زبان پر جو تمہارے دل میں ہے
کچھ نہ میں سمجھا کہ آخر میں ہوں تو یا تو ہے میں
کچھ نہیں کھلتا کہ دل تجھ میں ہے یا تو دل میں ہے
کشتی مجھے لگے بس [illegible]
یہ تو پوچھا تھا کچھ حسرت بھی ترے دل میں ہے
ناتواں تھا میں اٹھا سکتا نہ سختی راہ کی

کیا سمجھ کر جان دینے کو کہا تھا آپ نے
دیکھ کر لاشہ کو کیا جلدی پشیماں ہو گئے
دی جو گیسو میں گرہ آنچل سرک جانے لگا
جب لیا آنچل تو پھر گیسو پریشاں ہو گئے
مڑ کے دیکھا اوس نے دل سینوں میں بسمل کر دئے
منہ اودھر پھیرا تو جو بسمل تھے بے جاں ہو گئے

۱۶ — ولہ — ۱۷۴

دیکھنا شورش و فورِ گریۂ سرشار کی
گرد ہو بیٹھی جاتی ہے گھٹا اُس پار کی
سنگِ بارانِ ستم کا ہو رہا ہے مشورہ
کرتی ہیں گردوں سے باتیں چوٹیاں کہسار کی
ہم نے وہ میدان مارا ہے کہ جس میں ہر طرف
آرزو کا خون ہے یا لاش ہے پندار کی
شش جہت ہی اک گھر وندا رہ گذار سیل پر
جس میں گردوں ایک ٹیلی چھاؤنی دیوار کی
سب کو قسمت نے کیا ہے لا کے امن بند ائیں پلید
رہنے والی ہے اجل جس گنبد دوار کی

جان دے کر مر کے پہنچا ساحلِ مرقد پہ میں
تحصیل کر آفت بھنور کی موج کی منجدھار کی

صفحۂ عالم پہ طومارِ شبِ غم سے ہے رقم
مہر ہے اس پر ہمارے دیدۂ بیدار کی

بند ہو کر آنکھ پھر کھلنے کی ہے کس کو امید
لوٹ لے جتنی ہے دولت دیدۂ بیدار کی

دن جو ہیں اپنے خزاں کے کچھ بھلا لگتا نہیں
یہ فضا یہ چھاؤں یہ ٹھنڈی ہوا گلزار کی

ابر کو جوشِ جنوں میں دیکھ کر کہتا تھا میں
اوڑ رہی ہیں دھجیاں کیا دامنِ کہسار کی

موج ہے آب گہر کی مسکرا دینا ترا
شعلۂ یاقوت ہے جنبش لبِ گفتار کی

ہاتھ میں لے آئینہ کی طرح مشتاقوں کا دل
اوس میں صورت دیکھ اپنے نخوت و پندار کی

دیکھنے کی ہیں ادائیں سیکڑوں اور اک نگاہ
لکھی ہے قسمت میں گردش مردمِ بیمار کی

دشتِ حیرت میں تھا سرگرداں کہ اٹھا گردباد

کھل گئی مجھ پہ حقیقت گنبدِ دوار کی
جلوہ اس کافر کا جب دیکھا تو رکھ دی ہاتھ نے
مردم دیدہ نے سمرن آنسوؤں کے تار کی
نیم بسمل ہے نہ مرنا ہے نہ اب جینا ہے نظم
پڑ گئی اوچھی سر وہی ابروئے خمدار کی

۱۵ ۱۷۵

آ کے مجھ تک کشتیٔ مے ساقیا اولٹی پھری
آج کیا نذ ی بھی الٹی ہوا اولٹی پھری
آتے آتے لب پہ آہ نارسا اولٹی پھری
وہ بھی میرا ہی دبانے کو گلا اولٹی پھری
مڑ کے دیکھا اوس نے اور وار ابرو کا چل گیا
اک چھری سیدھی پھری اور اک ذرا اولٹی پھری
لا سکا نظارۂ رخسار روشن کی نہ تاب
جا کے آئینہ پہ چہرہ کی ضیا اولٹی پھری
راست بازوں ہی کو پیسا آسماں نے اے تدن
والے قسمت جب پھری یہ آسیا اولٹی پھری
جو بڑا بول ایک دن بولے تجھے پیش آیا وہی

گنبدِ گردوں سے ٹکرا کر صدا الٹی پھری

رزق کھا کر غیر کی قسمت کا زنبورِ عسل

تو نے دیکھا حلق تک جا کر غذا الٹی پھری

تو ستائش گر ہے اوس کا جو ہے تیرا مدح خواں

یہ تو اے مشفق ضمیرِ مرحبا[1] الٹی پھری

جس پہ آئی تھی طبیعت کی اوسی نے کچھ نہ قدر

جنسِ دل مانندِ جنسِ ناروا الٹی پھری

یا تو کشتی ڈوبتی تھی یا چلی ساحل سے دور

وائے ناکامی پھری بھی تو ہوا الٹی پھری

گرنے والا ہے کسی دشمن پہ کیا تیرِ شہاب

آسماں تک جا کے کیوں آہِ رسا الٹی پھری

بچ گیا میں اوس کے آ جانے سے دشمن مر گیا

دیکھ کر عیسیٰ کو بالیں پر قضا الٹی پھری

مر گیا لے موت میں آخر اجل بھی دور سے

گرچہ قاتل کا تقاضا کر تیا الٹی پھری

---

[1] یعنی مرحبا ایک جملہ ہے ... یا مرحبا بہ یعنی ضمیر جو ان دونوں ضمیروں کی جگہ ضمیر متکلم مقصود ہے یعنی مرحبا بی ۱۲

ہجر کی شب مجھ کو اولٹی سانس لیتے دیکھ کر
ایک ہی دم میں وہاں جا کر صبا اولٹی پھری
ہے مرا ویرانۂ غم تنگ ایسا [illegible]
صبح تک [illegible] اولٹی پھری

۱۵ — ۱۷۶

ایک دم کو حسنِ گل سے گلشن آرائی ہوئی
اک نظر اس باغ میں شبنم تماشائی ہوئی
صبح پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی
مسکراتی ہے سرہانے اجل آئی ہوئی
خندہ زن گل لب پہ غنچوں کے ہنسی آئی ہوئی
اے صبا کچھ تیری چال ایسی اٹھلائی ہوئی
اک قدم ہے اندرونِ خانہ اک بیرونِ در
سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی
منہ سے نکلی بات اور طوفان پر طوفاں اٹھے
اشک ٹپکا اور رسوائی ہی رسوائی ہوئی
حشر کے دن دنیا و عقبیٰ کی طرف کیا دیکھتا
مانعِ وہمِ دو عالم تیری یکتائی ہوئی

باز آئے کب سیہ کاری سے ہم مثل قلم
مدتوں سجدے رہے برسوں جبیں سائی ہوئی
باغِ عالم میں بہار زندگانی ہو تو کیا
ایک ہی دل کی کلی اور وہ بھی مرجھائی ہوئی
کج روی طینت میں ایسی ہو تو اس کا کیا علاج
راہ تو سیدھی ہے لیکن چال کترائی ہوئی
کوی رسوائی تک آنے کو نہ اوٹھا تھا قدم
دستگیر آخر کمندِ ناشکیبائی ہوئی
عشق کے شعلوں کو اب تو ہی بجھا لے چشم تر
یاد کر یہ آگ ہے تیری ہی بھڑکائی ہوئی
کھل گئے گل عقدۂ دل ناکشودہ ہی رہا
ناخنِ موجِ صبا سے بھی نہ گیرائی ہوئی
شام سے سوزِ شبِ غم نے مجھے دکھلا دیا
شمع کے منہ پر جو دیکھی مردنی چھائی ہوئی
گنبد اک وہ بھی ہے وہم و شک کی بازیگاہ کا
بات جو مجھی ہوئی ہے یا ہے سمجھائی ہوئی
تھے وہی علت عدم کی جو ہے علت کا عدم

باعث ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

۱۷۷ ۳۶

عشق میں جب تک جنوں کی کارفرمائی نہ تھی
گرمیِ ہنگامہ بازار رسوائی نہ تھی

شغل خود بینی تماشائے بزم آرائی نہ تھی
جلوہ گر تھا یار اور چشم تماشائی نہ تھی

کیا سمجھ کر دشت میں جاتا بہار آئی نہ تھی
کس طرح میں جھوم کر اٹھتا گھٹا چھائی نہ تھی

مجھ کو آوازِ شکستِ رنگ نے رسوا کیا
ورنہ دل کی بات تو لب تک کبھی آئی نہ تھی

جنگلوں میں خاک چھانی ہے جوانی کے لیے
منزلوں گرد رم آہوئے صحرائی نہ تھی

لذتِ دنیا کے خمیازہ کو ہم زندوں سے پوچھ
دم نکلنے کی یہ تھی تصویر انگڑائی نہ تھی

تبصرہ ۱۳۰: اپنی ناشناسائی ہنگامۂ ممکنات کا باعث ہوئی یعنی ہم خود کو نہ پہچان سکے سمجھ کر ہم بھی ہیں تو ساری کائنات کا ہونا لازم ہے ہم ناشناسائی یعنی عدم اور اک ہی اوّل عدم کا باعث ہوا اسی طرح ممکن کے لئے عدم ترجیح ترجیح عدم کا باعث ہے

ترک لذت میں بھی کچھ دل کو مزہ ملنے لگا
ورنہ کیا مجھکو ہوس بادہ پیمائی نہ تھی

وصل کیا ہوتا کہ طبع یار تھی خلوت پسند
اور اپنے گوشۂ خاطر میں تنہائی نہ تھی

جلوۂ گل کے تھے مشتاقوں میں ہم اک عمر تک
اور نرگس کی طرح آنکھوں میں بینائی نہ تھی

کون ہوش میں یاد ہوگا آپ کو یہ اے کلیم
برق ایمن سے کسی نے آنکھ جھپکائی نہ تھی

یا تو لے سکتا نہ تھا میں سانس یا تڑپا کیا
جان تازہ تھی یہ شاید ناشکیبائی نہ تھی

چشم تر دیکھنا دامن کسی نے آج تک
رہگزار سیل میں دیوار اٹھوائی نہ تھی

سوتے سوتے شور محشر جاگ اٹھا کس طرح
اے جنوں میں نے ابھی زنجیر کھڑکائی نہ تھی

ترک الفت کر کے نکھرا اور بھی گالوں کا رنگ
دل کو حسرت ہے کہ پہلے تو یہ رعنائی نہ تھی

دیکھنا ہے سیر اگر میرے تڑپنے کی تو دیکھ

یہ نہ کہہ دینا کہ بسمل میں شکیبائی نہ تھی

ساتھ غیروں کے تھے ہم بھی دور ساغر میں شریک

پی رہے تھے خون اپنا بادہ پیمائی نہ تھی

اب کہیں دل سے لگی رہتی ہے تو نے تب کہیں

یوں کبھی رنگ حنا نے آگ بھڑکائی نہ تھی

وہ تو آنکلا تھا لیکن ہو گئی کیا جلد صبح

میں نے اب تک زلف بھی چہرہ سے سرکائی نہ تھی

بات کی تو نے تن بیمار میں جان آگئی

سچ بتانا پھر یہ کیا تھا گر مسیحائی نہ تھی

آگیا کیا چین مجھ کو گر کے اس کے پاؤں پر

یہ علاج درد سر تھا ناصیہ سائی نہ تھی

صور اسرافیل سے بس جاگنے والا نہ تھا

کیا کہیں تو نے تو آکر قبر ٹھکرائی نہ تھی

ہم سے سچ کہ تخت پریوں کا اڑا جاتا کہاں

اتنی بھی کوتہ کمند ناشکیبائی نہ تھی

کشتی مے پر ہے اب تخت سلیماں کو بھی رشک

بادہ پیمائی تھی آخر باد پیمائی نہ تھی

قلزم مئی میں ہیں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے

آ گئی تھی لہر اک مستوں کی انگڑائی نہ تھی

زندگی گذری ہے کیونکر سچ بتانا اے اجل

لاکھ بار آئی تھی تو کچھ ایک بار آئی نہ تھی

ہم نے عالم میں کہیں دو دل ملے دیکھے نہیں

ان میں یکرنگی نہ تھی تو اون میں یکجائی نہ تھی

فرش استبرق بچھایا تھا نگاہِ شوق نے

حشر کے دن ہم کو فکر برہنہ پائی نہ تھی

کیوں نکل کر تو ہوا خلوت سے زیب انجمن

حسن بے پردہ تھا جب تک تو یہ رسوائی نہ تھی

کام مشکل آ پڑا تھا اور نہ تھا عزم درست

عقدہ تھا دشوار اور ناخن میں گیرائی نہ تھی

پھیر لیتی ہے نگہ تصویر بھی اس شوخ کی

پوچھتا ہوں جب کہ ہم سے کیا شناسائی نہ تھی

مہرباں ہوتے غریبوں پر تو گھٹ جاتی نہ شان

کیا تم آجاتے تو میری قدر افزائی نہ تھی

پست ہو جانے سے اپنے ہو گیا تیرا عروج

ورنہ کچھ تیری بساطِ چرخِ مینائی نہ تھی

ہم تھے ساقی تھا ہمارا میکدہ تھا جام تھا

جب زمانہ میں بنائے چرخِ مینائی نہ تھی

میرے لب سے ہو گیا کیسا گلِ رخسار سُرخ

تیرے لب سے برگِ گل اس طرح شرمائی نہ تھی

راہ میں شل ہو گیا برہان و حجت کا قدم

پیروی عقلِ نادانی تھی دانائی نہ تھی

پوچھتا ہے نظمؔ مجھ کو نرگسِ بیمار سے

کیوں چلی آئی چمن میں گر توانائی نہ تھی

11 — 178

شرم یہ کیوں ہے تبسم ہائے پنہاں کس لئے

سر پہ آنچل کس لئے منہ پر ہے داماں کس لئے

غور کر طرزِ جفا کو دیکھ اندازِ وفا

تیغ گریاں کس لئے ہے زخم خنداں کس لئے

کھول کر بندِ کفن پوچھے کوئی احباب سے

منہ چھپا کر جاتے ہیں اس گھر سے مہماں کس لئے

سر بزانوئے توکل تن بہ آغوشِ رضا

ذکر سر کس واسطے ہے فکر ساماں کس لئے

صحبتِ بے مغز گر اندازِ ساں ہوتی نہیں
دردِ سر رکھتا ہے پھر شیر نیستاں کس لئے

سن کے حرفِ آرزو جامہ سے کیوں باہر ہوئے
خنجر بے کچھ ہوگئے شمشیرِ عریاں کس لئے

منہ سے تو نے کہہ دیا جو آگیا مجھ کو یقیں
جستجوئی قیس کس لئے ہیں عہد و پیماں کس لئے

ہو کے تائب شیخ سے بیعت بھی کر کے دیکھ لی
چاک اب باندھوں نہ پیمانے سے پیماں کس لئے

اک نگاہِ لطف ہو اوس کی تو یہ سب ہیں نثار
جان و دل کس واسطے ہیں دین و ایماں کس لئے

خضر بھی ہیں غرقِ گردابِ اجل میں ایکدن
اے سکندر ہے تلاشِ آبِ حیواں کس لئے

کس بہارِ حسن سے اے نظمؔ تھا تو ہمکنار
چاک ہیں گل کیطرح جیب و گریباں کس لئے

۶ ۱۶۹

مے پلا ساقی ارے فصلِ بہار ایسے میں ہے

آب حیواں وے حیات مستعار ایسے میں ہے

سچ ہے اے ناصح کہ یہ ہنگام مے نوشی نہیں

مجھ کو جلدی ہے کہ دست اختیار ایسے میں ہے

پھر نہ یہ سمرن ملے گی یاد حق کے واسطے

آنسوؤں کا پنجۂ مژگاں میں تار ایسے میں ہے

وقت ہے صید رمیدہ جاکے آنیکا نہیں

وار کرنا ہو تو کر زور پر شکار ایسے میں ہے

بعد اس کے پھر گلے سے بھی ملا قاتل تو کیا

پھیر دے آکر چھری دل بے قرار ایسے میں ہے

دیکھ تو حیدر کوئی دم ابھی ہے پرسان حال

چند ساعت اور ابھی روز شمار ایسے میں ہے

۱۸ — ۱۸۰

سنگ پانی ہونے کو بانی ہوا ہولنے کو ہے

دیکھ اے منکر یونہی دنیا فنا ہونے کو ہے

پرسش اہل گنہ روز جزا ہونے کو ہے

گرمی بازار جنس ناروا ہونے کو ہے

اپنی بے صبری سے عکس مدعا ہونیکو ہے

آئینہ دار اثر دست دعا ہونیکو ہے
دل وہی دل ہے جو اس کا مبتلا ہونیکو ہے
جان ہے وہ جان جو اس پر فدا ہونیکو ہے
ایڑیوں تک دوش سے گیسو رسا ہونیکو ہے
پڑھتے ہی بڑھتے یہ افعی اژدہا ہونیکو ہے
قتل سے میرے پشیماں بے وفا ہونیکو ہے
اک ستم تو ہو چکا اب دوسرا ہونیکو ہے
گو سراپا مثل اخگر ہوں گرہ کچھ غم نہیں
خاک ہو جانا مرا عقدہ کشا ہونیکو ہے
بزم میں ساغر کسی کے واسطے کوئی بھرے
میں سمجھتا ہوں کہ میری ہی صلا ہونیکو ہے
شان اُس کی دیکھ کر مجھسے کھے ہم روز الست
دولتِ کونین بے مانگے عطا ہونیکو ہے
کس طرح بازو پہ میرے ڈھونڈ عالے چشم زخم
اوس کی سفا کی پہ شور مرحبا ہونیکو ہے
ہاتھ سے آئینہ جب رکھا تھا سمجھا تھا یہ میں
ہو چکا ہے تیز خنجر اب جفا ہونیکو ہے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہے خیالِ خالِ رخ
دانۂ زنجیر کو نشو و نما ہونے کو ہے

یاس میں مجھ کو تسلی دے رہی ہے بیخودی
پردہ اب اوٹھنے کو ہے اب سامنا ہونیکو ہے

چپکے چپکے ظلم کرنا چھپ نہیں سکنے کا اب
ناوکِ بیداد میں پیدا صدا ہونیکو ہے

فکرِ بے جا ہے منغص کیجیے کیوں عیش کو
یہ تو ہے معلوم قسمت کا لکھا ہونیکو ہے

چل کے زنداں و گریباں کے ستم کی داد
مژدہ اے اہلِ جنوں محشر بپا ہونیکو ہے

آ گیا ہے شرمِ عصیاں سے جو آنسو آنکھ میں
یہ کے رخساروں پہ دُرِّ بے بہا ہونیکو ہے

یہ نگارستانِ ہستی مظہرِ قدرت سہی
نقش ہو گر آبِ حیواں پر فنا ہونے کو ہے

۱۵ ولہ ۱۸۱

لہر میں دریائے ہستی کی حباب آنیکو ہے
جو کوئی آنیکو ہے پا در رکاب آنیکو ہے

حسن کی آئینہ داری کو شباب آنیکو ہے
زلف میں بل گیسوؤں میں پیچ و تاب آنیکو ہے

مژدہ اے دل پھر ہوئے انقلاب آنیکو ہے
دورِ گردوں ہو چکا دورِ شراب آنیکو ہے

آنکھ میں تیری مروت بھول کر آتی نہیں
شرم سو بار آنے کو حجاب آنیکو ہے

کہہ دیا بس۔ فال بد منہ سے نہ او دو لفظ نکال
مجھ پہ رحمت آ تو تیری تجھ پر عذاب آنیکو ہے

جا چکی تاب و تواں بس اب ہے اتنا انتظار
زندگانی کی طرف سے بھی جواب آنیکو ہے

پتلیاں پتھرا چلی ہیں کہتے کرتے انتظار
چارہ گر خوش ہو کہ اب آنکھوں میں خواب آنیکو ہے

دیکھیے کیا رنگ ہو محفل کا اہلِ مصر کی
ہاتھ میں چھریاں ہیں یوسف بے نقاب آنیکو ہے

ہجر کی اک شب میں گھڑیاں گن چکی ہیں دو ہزار
اے فلک سمجھوں گا میں روزِ حساب آنیکو ہے

سونے والو وقت آخر ہو گیا اب تو اٹھو

لے کے آئینہ لب بام آفتاب آنیکو ہے

شیشہ توبہ نہ جوش کشمکش میں ٹوٹ جائے
جھوم کر صحن گلستاں میں سحاب آنیکو ہے

آ گئی عارض پہ سرخی ہر طرح سے ہے ستم
یا حجاب آنیکو ہے یا اب عتاب آنیکو ہے

خانۂ دل سے اوٹھائیں اپنا بستر صبر و ہوش
اس سرا میں کاروانِ اضطراب آنیکو ہے

جوشِ گل کی کشمکش میں آ گیا سبزہ کو غش
شیشۂ شبنم میں کھنچ کھنچ کر گلاب آنیکو ہے

نظم دیکھیں مصطفیٰ کا جانشیں ہوتا ہے کون
عرش سے مسجد میں حکم سد باب آنیکو ہے

۱۶ —— ولہ —— ۱۸۲

جشن جم کا ماجرا بادِ صبا سے پوچھ لے
کیا ہوا تختِ سلیمانی ہوا سے پوچھ لے

واور حشر آرزوں کا نکلنا تو کجا
جان بھی مشکل سے نکلی ہے قضا سے پوچھ لے

کشتۂ تیغ تغافل کی نہیں تجھ کو خبر

میں بتاؤں تجھ کو تو اپنی ادا سے پوچھ لے

پوچھتا کیا ہے کسی سے دل کو دل کی ہے خبر
سارا حال اس ساغر گیتی نما سے پوچھ لے

دو گواہوں سے پریشانی کا میری ہے ثبوت
گر تجھے باور نہیں زلفِ دوتا سے پوچھ لے

ہر قدم پر آتی ہے شہر خموشاں سے صدا
خاک میں ہم مل گئے ہیں نقش پا سے پوچھ لے

اے جنوں لے چل کسی جنگل میں ہے جوشِ بہار
راہ بجلی بن کے اس کالی گھٹا سے پوچھ لے

آ گیا آتش قدم کہنے پہ تنہا اس قدر
جھوٹ کیا ہے شعلۂ رنگِ حنا سے پوچھ لے

لوٹنا بھی دل کا ظالم دیکھنے کی سیر ہے
آنکھ اوٹھانے کے لئے شرم و حیا سے پوچھ لے

زالِ دنیا کے فریب و مکر سے غافل ہے تو
بے وفائی اس کی مردانِ خدا سے پوچھ لے

جوشِ مستی میں نہ آتا بے حجابانہ گذر
راہ میں آنکھیں بچھی ہیں نقش پا سے پوچھ لے

ہے زبانِ شمع خاموشی میں بھی صرفِ سخن
بزمِ ہستی کی خبر اہلِ فنا سے پوچھ لے
معت کا کچھ ہو گر پھرنا پڑے مثلِ ضمیر
دور کیوں جا تو خبر کو مبتدا سے پوچھ لے
منفعل ہو تو نہیں ہے اس کی رحمت میں کمی
چشمِ تر سے پوچھ لے دستِ دعا سے پوچھ لے
جس ہنر سے خود بخود عارف ہی سیکھے اوستاد سے
راستہ جو بھول جائے رہنما سے پوچھ لے
پھر شکیبائی کا دعویٰ ہو چلا ہے نظمؔ کو
پھر مزاج آکر ذرا ناز و ادا سے پوچھ لے

۱۸۳

منزلوں کو عشق کی اہلِ جنوں سے پوچھئے
حال یہ یارانِ نجد بے ستوں سے پوچھئے
دل کے خوں ہونے کی حالت اشکِ خونیں سے پوچھئے
جان پر کیا بن گئی سوزِ دروں سے پوچھئے
آسماں سے کیجئے باتیں ذرا بن کر غبار
وجہ بربادی کی کچھ گردونِ دوں سے پوچھئے

سن سکیں گے آپ کیونکر دل کی بیتابی کا حال
پوچھیے لیکن ذرا صبر و سکوں سے پوچھیے
سرکشی کا دیکھیے سرو و صنوبر کی ثمر
جھومنے کی وجہ شاخ سرنگوں سے پوچھیے
دہرے مانند قلزم آسمان مثل حباب
تھاہ کو پھر اس کی کیا گردون دوں سے پوچھیے
تا لب آتا ہے نالہ ارغنوں لیتا ہوا
وجہ بیتابی کی لذت ارغنوں سے پوچھیے

۱۴ ولہ ۱۴۸

عشق خطا سے ہے سوالفت لب خاموش کی
بڑھتی ہی رہتی ہے گرمی آتش خس پوش کی
ہم نے اس ساماں سے لی کوچہ قاتل کی راہ
بار گردن سر کیا گردن وبال دوش کی
کاسہ سر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھے وہیں
ہر قدم پر جس جگہ محفل تھی نادنوش کی
خاکدان دہر کے چھٹنے کی پروا کچھ نہیں
تیرا دیوانہ یہ سمجھا گرد تھی پاپوش کی

قبر پر آیا بھی تو شوخی سے باز آیا نہ وہ
شمع مدفن تکا دہ روشن کی کبھی خاموش کی

دیکھ کر پھولوں پہ شبنم یہ ہے مستوں کو گماں
رال ساغر پہ ٹپکتی ہے کسی مے نوش کی

کیا کمند زلف کم تھی قتل عالم کے لئے
اوس پہ یہ طرہ ہوا الوا زیب دوش کی

رنج دنیا اس قدر مجھ سے رہا دست و بغل
وسعت عالم ہوئی تنگی مری آغوش کی

مٹ نہ جائے آسماں اک دن لہر، د کی طرح
اشک غم میں شوخیاں ہیں طفل بازی گوش کی

احتمال اب تو مکان کا لامکان پہ ہو گیا
بڑھ گئی ہے اس قدر پرواز میرے ہوش کی

جاتے ہی منبر پہ واعظ آپ سے باہر نہ ہو
الحذر اے مہرباں کچھ حد بھی ہے اس جوش کی

خط ساغر دور سے ساغر کے نکلے کس طرح
یہ نگاہ مست ہے ساقی کسی مے نوش کی

ہے بجائے خود کمال شوق بھی مشکل

تنگ آیا یار کا تنگی ہوئی آغوش کی

آرزوئے دل کو سن کر یہ فرماتے ہیں وہ
جی میں کیا اے نظم ہے باتیں کرو کچھ ہوش کی

۱۸۵ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۴

کیا کہیں کیونکر تمہے کیونکر چلے
مضطرب آئے یہاں مضطر چلے

غیر کے گھر اس طرف ہو کر چلے
مفت کا احسان مجھ پر دھر چلے

ضعف میں بھی ہو گئی طے راہ شوق
ہر جگہ گر گر کے اوٹھے اوٹھ کر چلے

کیا نگاہ آفت تھی کیا عشوہ تھا قہر
بزم میں چھریاں چلیں خنجر چلے

زیر گردوں زندگانی تھی پہاڑ
آفتیں جھیلیں مصیبت بھر چلے

ہو تواضع بھی مگر تمکیں کے ساتھ
چاہیے جھک کر ملے رک کر چلے

سندس و قاقم کی بھی پروا نہ کر
جب تک اپنا گیر و الستر چلے

کیا مزاج دہر کی اصلاح ہو
چار دن اپنی سی ہم بھی کر چلے

اس کو تھی تیغ آزمائی کا ذوق
کیا ہوا اگر زخم میرے بھر چلے

ساقیا ہم سب ہیں رندان پاکباز
جادۂ تسلیم پر ساغر چلے

خاک ہو جاؤں تو پہنچوں اوڑ کے کاش
کچھ تو میرا زور گردوں پر چلے

قبر میں جھٹ گٹ گئے پورے ہو جائیں ہم
ہائے یہ ٹھنڈی ہوا باہر چلے

وہ تو دل لیتے ہی بازی لے گیا
داؤ اپنا دیکھیے کیونکر چلے

کشتیِ مے لے کے ساقی جلد آ
جھومتے دریا پہ ابرِ تر چلے

۱۸۶ — ۳۱

تندیٔ مے حیرت افزا ہو گئی
موجِ برقِ طورِ سینا ہو گئی

جب زبانِ حال گویا ہو گئی
بات خاموشی میں پیدا ہو گئی

دل میں اٹھی تھی ابھی اک لہر سی
آنکھ تک پہنچی تو دریا ہو گئی

عیش کی رات اس قدر کوتاہ تھی
شامِ امشب صبحِ فردا ہو گئی

دب گیا گردِ کدورت میں جو دل
دفن ساتھ اس کے تمنا ہو گئی

آتی ہے تارِ نفس سے یہ صدا
روحِ مرغِ رشتہ بر پا ہو گئی

ضبطِ گریہ تجھ کو راس آتا نہیں
پھر کھٹک آنکھوں میں پیدا ہو گئی

دل میں چپکے سے برا آیا خیال
اور خبر عالم میں افشا ہو گئی

پھر تجھے انساں کو نظر آتا نہیں
آنکھ جب محوِ تماشا ہو گئی

ہاتھ رکھتے ہی دلِ بیمار پر
مضطرب نبضِ مسیحا ہو گئی

کچھ نشاں تجھ کو ملا اے خاکِ جم
تیری دولت کس کی یغما ہو گئی

پیرزن کے کلبۂ تاریک سے
روشنیٔ طاقِ کسریٰ ہو گئی

چشمِ موسیٰ کو تھا ایسا شوقِ دید
اک نگہ برقِ تجلی ہو گئی

عشق کے اس شعبدہ کو دیکھنا
پھر جوان کیونکر زلیخا ہو گئی

دست و پا مارے کسی نے اب تو کیا
سر سے اونچی موجِ دریا ہو گئی

آگیا گلشن میں فرمانِ بہار
زلفِ سنبل خطِ طغرا ہوگئی

عشق بھی اک قوتِ اشرف ہے
دل سے دل میں راہ پیدا ہوگئی

وار پر کھینچو سزا اس کی یہ ہے
کیوں طبیعت ناشکیبا ہوگئی

دل میں تو نے جو چھپا رکھی ہے بات
وہ بھی چتون سے ہویدا ہوگئی

ہوگئی نانِ جویں سدِّ رمق
لیجئے آباد دنیا ہوگئی

نظم کھینچا تو نے دنیا سے جو ہاتھ
دیکھ کر نعمت مہیا ہوگئی

۱۴۷ — ولہ — ۱۳

سبحے زنار کیوں کیسی کہی
زاہدِ عیار کیوں کیسی کہی

کٹ گئے اغیار کیوں کیسی کہی
چھا گئی ہر بار کیوں کیسی کہی

ہیں یہ سب اقرار جھوٹے یا نہیں
کیجئے اقرار کیوں کیسی کہی

روٹھنے سے آپ کا مطلب یہ ہے
اس کو آئے پیار کیوں کیسی کہی

کہہ رہا میں سنے رہے جھوٹ موٹ
ہوگئے بیدار کیوں کیسی کہی

ایک تو کہتے ہیں مدہا کھتیاں
اور پھر اصرار کیوں کیسی کہی

آگیا یہ بحث دیوانوں کے ساتھ
عقل کی ہے ہار کیوں کیسی کہی

یا جنوں سمجھے یا ذرا سی بات پہ
ہوگئی بوچھار کیوں کیسی کہی

مجھ سے بیعت کرلے تو بھی واعظا
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

سرمہ دے کر دل کے لینے کا ہی قصد — آنکھ تو کرچار کیوں کیسی کہی
جان دیدے چل کے در پر یار کے — او دل بیمار کیوں کیسی کہی
کیا ہی بگڑے ہو پتے کی بات پر — ہو گئے بیزار کیوں کیسی کہی

اب تو حیدر اور ہی کچھ رنگ ہیں
مانتا ہوں یار کیوں کیسی کہی

۱۸۸ ——— فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ——— ۱۷

ہیچ نظروں میں اگر عالم فانی ہو جائے — پھر یہی ہیچمدانی ہمہ دانی ہو جائے
کشتی بادہ میں پیدا وہ روانی ہو جائے — رنگ بحر فلک آبی بھی پانی ہو جائے
کاش دل کش مری آشفتہ بیانی ہو جائے — درد دل تو نہ مرا اس کی کہانی ہو جائے
دل اگر رہبر اقلیم معانی ہو جائے — مرتفع بعد مکانی و زمانی ہو جائے
خسرو عشق نے تیشہ وہ عزت دی — سر فرہاد پہ جو تاج کیانی ہو جائے
جوش میں آئے اگر دل ہی اک قطرہ خوں — گرم ہنگامہ خونابہ فشانی ہو جائے
جائے عبرت ہے کہ یوں کوچ کرے لشکر گل — جرس قافلہ اک برگ خزانی ہو جائے
آن رہ آشفتگی شوق میں تاثیر سے شرط — پھر تو تصویر کی طرف دیکھے پانی ہو جائے
کبھی مدفن کا ہے ذکر کبھی حشر کا ذکر — پاس واعظ کے جو بیٹھے خفقانی ہو جائے
دہن زخم ہے ستیں کے لئے ہر دم وا — گر زیادہ تیرے خنجر کی روانی ہو جائے
شکوہ حیدر جو کرتا ہوں تو ملتا ہے جواب — صبح ہو جلد ہیں ختم کہانی ہو جائے

کس قدر جوش ہے واعظ کہیں ایسا تو نہ ہو
صرف نعروں ہی پہ زورِ ہمہ دانی ہو جائے

گوشِ ہر پند کبھی اور کبھی ناشنوا
دیکھ پتھر نہ سماعت کی گرانی ہو جائے

رشتہ در رشتہ جو ہے طولِ املِ لطف نہ ہو
صید اس دام میں طاؤسِ جوانی ہو جائے

چمنستاں میں عنادل کا ہوا ایسا تو ہجوم
شاخِ گل جو ہو وہ ارگن کی کمانی ہو جائے

ہاتھ میں لے کے عصا طور پہ آئے ہیں کلیم
آشکارا نہ کہیں حالِ شبانی ہو جائے

راہِ مولیٰ میں اگر نظم کو آ جائے اجل
گردِ صحرائے نجف بُردِ یمانی ہو جائے

۱۸۹ — ۱۲

وہ جو برہم ہیں تو بگڑی ہوئی تدبیر بھی ہے
مستعد لڑنے پہ مجھ سے مری تقدیر بھی ہے

دیکھیں اب ملتی ہے کیا داد ہمیں محشر میں
دل بھی قاتل بھی ہے پیکاں بھی ہے تیر بھی ہے

چاہے وہ قتل کرے چاہے مجھے قید کرے
سر بھی شمشیر بھی ہے پاؤں بھی زنجیر بھی ہے

منہ سے شکوہ تو میں کرتا نہیں خود دیکھ لیں آپ
دل میں اک زخم بھی ہے زخم میں اک تیر بھی ہے

دلِ مضطر کی اسیری کے ہیں ساماں کیا کیا
زلف و کاکل بھی ہے گیسوئے گرہ گیر بھی ہے

خونِ ناحق کو بھلا حشر میں ثابت کرے تو بھی
تیغ و صیاد بھی ہے ترک بھی نخچیر بھی ہے

کس کو دیتا ہے خدا فتح و ظفر کس کو شکست
دیکھنا بختِ جواں بھی ہے فلک پیر بھی ہے

ہم نے ان زہد فروشوں کو بہت دیکھا ہے
کچھ حقیقت بھی ہے کچھ حیلہ و تزویر بھی ہے

لے چکے جان اشارے ہیں مژہ و ابرو کے
کشتۂ تیغ بھی ہے دل ہدفِ تیر بھی ہے

آئینہ رکھ کے ہی منظور اسے آرائش بھی ہے — اسی پردہ میں مگر قتل کی تدبیر بھی ہے

نہیں کھلتا سبب غفلت اہل عالم — نہیں معلوم کچھ اس خواب کی تعبیر بھی ہے

چا- کر تم کو گنہ گار رہو انظم حزیں
قابل قتل بھی ہو لائق تعزیر بھی ہے

١٩٠ —————— ١٦

لے کے ساغر سروپا کا نہ رہا ہوش مجھے — کر دیا فکر دو عالم سے سبکدوش مجھے

ہو گیا دام کا خطرہ بھی فراموش مجھے — طبع رنگیں نے نہ رہنے دیا خاموش مجھے

میں نے کہتے ہوئے کعبہ کو سنا ہے اکثر — کر دیا ہے غم عالم نے سیہ پوش مجھے

بزم عشرت میں جو آجائے وہ مست اے ساقی — میں سنبھالوں اسے اتنا تو رہے ہوش مجھے

کہہ رہا ہے یہی نقش خط پیمانۂ جم — پی گئے گھونٹ کے رندان قدح نوش مجھے

کھول کر میں گرہ زلف پشیمان ہوا — نظر آیا وہ ستم گار زرہ پوش مجھے

عہد پیری میں ہوں وہ شمع مزار حسرت — کہ نسیم سحری کر گئی خاموش مجھے

دیدہ و دل سے پھر آج گہہ حیرانی — ہائے اے پیر مغاں آ گیا پھر ہوش مجھے

ہو جو ممکن تو رگ جاں میں گرہ دے رکھوں — کہ تری یاد نہ ہو جائے فراموش مجھے

عیش کی عمر ہے کوتاہ نہیں شک اس میں — شب گیسو میں ہوئی صبح بناگوش مجھے

خوف یہ ہے نہ کہیں وار اجل کا چل جائے — جھریاں کہتی ہیں پیری میں نہ رہ پوش مجھے

الفت مادری آخر تھی زمیں کو مجھ سے — کس محبت سے لیا کھول کے آغوش مجھے

اس کی رحمت کے میں صدقے کہ دیا اے زاہد
دل افسردہ تجھے خاطر پر جوش مجھے

بادشاہی تھی گدائی در پیمانہ کی
کہ سلیماں کی طرح لیکے اوڑا ہوش مجھے

نقش حسرت ہوں کسی نے نہ کیا پیش چشم
حرف عبرت ہوں بنایا نہ در گوش مجھے

پرسش حشر سے اے نظم بچا لے گی ضرور
اوس کی درگاہ عطا پاش خطا پوش مجھے

۱۹۱ ——— ۱۵

دیکھے وہ زلف کہ یا قد رعنا دیکھے
جس کے آگے تو خراماں ہو وہ کیا کیا دیکھے

کس کو وہ دیکھے ترا جو رخ زیبا دیکھے
چاند یہ دیکھ کے پھر منہ نہ کسی کا دیکھے

کوئی کب تک ادا ناز تماشا دیکھے
روٹھ جانا ترا دیکھے کہ مچلنا دیکھے

خیر ناصح ہی اگر سحر بیاں ہونے دو
میں سمجھنے کا نہیں وہ مجھے سمجھا دیکھے

شکوۂ ظالم کا زباں سے تو نہیں کرنے کا
میں دکھاؤں جو کوئی میرا کلیجا دیکھے

دور ہے حور ہی ساغر بکف و عشوہ نما
آنکھ جس نے تری دیکھی ہو ادھر کیا دیکھے

میری بیتابی دل کی ہوا و نہیں کیا پروا
جن نگاہوں نے دو عالم تہ و بالا دیکھے

شام ہی سے غم فرقت میں ہے مرنا منظور
کیوں جیے اتنا جو طول شب یلدا دیکھے

تھا کرشمہ یہ شب عیش کی کوتاہی کا
صبح اور شام کو یوں تو کوئی یکجا دیکھے

بدمزاجی کی بھی کچھ حد ہے الٰہی توبہ
چھیڑ دے کوئی ذرا اور تماشا دیکھے

زاہد خشک کو دعوی ہے شکیبائی کا
سامنے اس بت کافر کے ذرا آ دیکھے

جس کو منظور رسائی ہو ترے کوچہ تک
پیچھے دونوں کھائے ہوا دشت کی ٹھوکر دیکھے

ہو جسے شکل حباب ایک نگہ کی فرصت
کھول کر آنکھ کو جاتی ہوئی دنیا دیکھے

چاہیے دہر میں دو عاقبت اندیش نظر
جو کہ امروز کو آئینۂ فردا دیکھے

جوش گریہ ہے علاج غم دیوانۂ عشق
دل سنبھل جائے جو بہتا ہوا دریا دیکھے

۱۹۲ ——— ولہ ——— ۲۱

جلوہ کن پلکوں سے ہے ترے نور نہیں
کیا کمی ہو گئی تمنا مری بر لانے سے

سرکشی نفس کی ہے باعث بربادی دل
لہر پیدا یہ ہوئی سانپ کے بل کھانے سے

آنکھ تھی محو تماشا کہ گری اک بجلی
برق پیدا یہ ہوئی دل کے تڑپ جانے سے

عقدۂ سر حقیقت نہ ہوا حل اب تک
گتھیاں اور بھی پڑتی گئیں سلجھانے سے

قید ہستی کی گر سلسلۂ تار نفس
زندگی ہوتی ہے زنجیر کے کھڑکانے سے

روئے جی بھر کے بیمار دل نکل گیا ذرا
فائدہ کیا سر شوریدہ کے ٹکرانے سے

تو نے دوزخ میں گرایا مجھے اے نفس زبوں
شعلے او بھڑکنے لگے آتش کے بھڑکانے سے

دیکھ کر جلوۂ جاناں میں ہوا گم ایسا
آپ کو پا نہ سکا آپ میں بھی آنے سے

چشم بینا کو نظر آتے ہیں اسرار نہاں
پردۂ ابر میں بجلی کے چمک جانے سے

سارا عالم مری نظروں میں ہے خورشید نما
ذروں میں مہر کی تصویر اتر آنے سے

دیکھ اک کوٹھری کاجل کی ہے بنا دنیا
لے نجات ابدی بچ کے نکل جانے سے

زیست کا لطف گیا ساتھ دل زندہ کے
جل گیا نخل بھی اس پھول کے کملانے سے

دے چکا بندے کو ان دو جہاں وہ پہلے
اصل قیمت کو سمجھ لیجئے بیعانے سے

اپنی دنیا تو بنالی تھی ریاکاروں نے
ٹل گیا خلد بھی اللہ کو پھسلانے سے

داور حشر گنہ گاروں سے پرسش کیسی
فائدہ قصۂ پارینہ کے دہرانے سے

وس طرف عرش کے ہے منزل مقصود اپنی
رہ گیا میں کشش ارض میں آ جانے سے

دیکھ لی دیکھ لی نیت تری ہم نے ساقی
بادہ کم ہو تو نہ کچھ جام کے چھلکانے سے

آگے تو تیرے یہاں کام نہیں ناصح کا
میں سمجھ جاؤں گا سب کچھ ترے سمجھانے سے

کرسی عدل کی اصغر نے بڑھا دی توقیر
داوری گاہ عدالت میں جگہ پانے سے

اوج یہ مجلس اعلیٰ کی سفارش سے ملا
اور سلطان حق آگاہ کے فرمانے سے

داد لیتا ہوں میں اے نظم نوا سنجی کی
ابر کے جھومنے سے بحر کے لہرانے سے

۱۹۳ ـــــــــــــــــــ ے

یاد تھے ہم کو بہت ذکر پرستانوں کے
سننے والے نہ رہے اب تو ان افسانوں کے

مسکرانے سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے
بزم میں کھلنے لگے پھول بھی گلدانوں کے

گرد میں قافلۂ نکہت گل کی سمجھا
دیکھ کر رنگ یہ بدہ کو گلستانوں کے

آتش افروز ہوئی برق صدائے مطرب
نغمہ نے نہیں شعلے میں فتیانوں کے

بار خاطر تو نہ ہو جا کہیں اے طول امل
بس بچاؤں میں کہیں تجھ سے ارمانوں کے

پتلیوں کا یہ تماشا تھا جو دیکھا ہم نے
ہاتھ پڑتے ہیں ترا سلسلہ جنبانوں کے

قدرت نغمہ سے ہوتی نہیں رحمت محسوس
ناقہ چلتا ہے ترنم پہ حدی خوانوں کے

بسملوں کو بھی تڑپتے نہیں دیکھا ایسا
چاندنی شمع کی مقتل میں ہے پروانوں کے

لے چل اے جذبۂ دل آنکھ بچا کر مجھ کو
پھر سے بیٹھے ہوئے رہ جائیں نگہبانوں کے

ڈال دی نالۂ پر درد نے اون پہ بھی کمند
کنگرے عرش سے اونچے تھے جن ایوانوں کے

ہیں حوادث بھی زمانہ کے وہ اعجاز رقم
نقش رہ جاتے ہیں ہر نخل میں طوفانوں کے

نخل آشوب سے اس عقد فلک کے بچ کر
کچھ بگولے ہیں سر راہ بیابانوں کے

آزمانے کو جو اپنے زمانہ کی چلا
دیو بھی مجھ کو ملے بھیس میں انسانوں کے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ارباب کمال
حوصلے اور بڑھے جاتے ہیں نادانوں کے

خوان نعمت پہ ہجوم اہل ہوس کا ہے عبث
من و سلوی نہیں حصہ میں مگس رانوں کے

بحر موجوں سے گلا اپنا چھڑا کر نکلا
رہ گئے دام جو بچھے تھے گریبانوں کے

چل اے باد مراد آکہ ہے کشتی اپنی
منہ میں گرداب کے آشوب میں طوفانوں کے

کتنے معمورۂ عالم تھے کہ اب ان کی جگہ
خاک ہی خاک ہے دامن میں بیابانوں کے

اوس کی محفل میں خبر کچھ دل آشفتہ کی نہیں
لوٹتے ساتھ ابھی دیکھا تھا ارمانوں کے

مجھ کو حیرت ہے کہ خسار تو لوٹتے ہیں
اور کھلاتے نہیں پھول کبھی کانوں کے

ہم نے بھی گوشۂ عزلت میں کئے ہیں کام
کارنامے جو تہمتن کے ہیں میدانوں کے

ایسے دروازہ کو بس دور سے ہی اپنا سلام
جس جگہ ناز اٹھانے پڑیں دربانوں کے

ہیبت عدالت دولت عثمانی سے
شیر ہیں لرزہ بر اندام نیستانوں کے

چاہیے عرش کے مضمون غزل میں نظم
ساتھ ہی اس کے مضامین پریشانوں کے

۱۹۴

مجھ کو اے یار ذرا چشم نمائی ہوتی
دل تو مل جاتے جو آنکھیں لڑائی ہوتی

دے کے مے پیر مغاں نے مجھے روکا ورنہ
داورِ دولتِ کونین گدائی ہوتی

راز سے دل کے نہ کرتا جو زباں کو آگاہ
بات جو اپنی تھی کاہے کو پرائی ہوتی

دل سے حسرت کا نکلنا تھا اگر ناممکن
ساتھ لیتی ہوئی دل کو نکل آئی ہوتی

سامنے داورِ محشر کے کہتے پھر آپ
پہلے مجھ سے تو ذرا آنکھ ملائی ہوتی

ضبط بیتابیِ دل نے جو بنایا تھا عصا
ایک آنسو نے وہ دیوار گرائی ہوتی

ہو تمہ رشک یمن جس طرح قفس میں صیاد میں ہو
یہیں رہ جاتا تڑپ کر جو رہائی ہوتی

کوئی تدبیر جو بنتی تو بگڑ بیٹھتے
کبھی تقدیر جو لڑتی تو لڑائی ہوتی

ٹوٹ جاتی جو یہ زنجیر تو اے دست جنوں
شہر سے وادیِ وحشت میں کلائی ہوتی

توبہ جب کر چکے ہم ابر آیا بھی تو کیا
لطف جب تھا کہ گھٹا آنکھوں میں چھائی ہوتی

وضع ہم خانہ بدوشوں کی نباک ای خضر
چھاونی عالمِ فانی میں چھائی ہوتی

اوجِ غربت سے گراتی نہ اگر حرص مجھے
آسماں کو ہوسِ ناصیہ سائی ہوتی

رشک خور رک نہ سکا خیر ہوئی یہ ورنہ
اس پتنگے نے ابھی آگ لگائی ہوتی

دل کے ارمان اگر تھے نہ نکلنے والے
دم نکلنے کی تو امید بر آئی ہوتی

گل نے کیا جانے سنا پانی ہے کس کی آواز
کان بجتے ہیں ابھی تک وہ صدا آتی ہے

اے صبا سیرِ گلستاں میں یہ مستانہ روی
تو قدم لے گلِ نسریں کی اٹھا آتی ہے

موسمِ گل میں جو جامہ میں سماتا مشکل
ٹھیک آتا ہے گریبانِ قبا آتی ہے

شنوا ہو تو کوئی شوق تو ہو منزل کا
سیکڑوں کوس سے آوازِ درا آتی ہے

دشتِ غربت سے بڑھی جو تو ہاں خیال
ساسی حیرت نقشِ کفِ پا آتی ہے

منزلِ گور ہے اس دشت کی پہلی منزل
دل کے آجانے سے پہلے ہی قضا آتی ہے

دم جو لیتا ہے ذرا کوہ کنی میں فرہاد
جا کے شیریں کو یہ آوازِ سنا آتی ہے

خلوتِ وصل میں کیا بیکلی ہے جو حیرت کس کی
آتی ہے شرم کبھی تو رو قضا آتی ہے

اس کا دم بھرتے ہیں کیونکے ہو دنیا الگ
ہر نفس میں خبرِ ارض و سما آتی ہے

خود تو مخمور ہے اوروں کو نصیحت زاہد
کچھ تجھے شرم بھی اے مردِ خدا آتی ہے

لطف جب ہے کہ برسنے لگے میخانہ پر
جھومتی قبلہ سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

کیا عجب ہے کہ ادا بھی کرے سجدۂ شکر
جھومتی قبلہ سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

وہ چلا گورِ غریباں کو خدا خیر کرے
لو قیامت سرِ خاکِ شہدا آتی ہے

دل نے باتیں شبِ فرقت میں رہیں صبح تلک
اس کہانی میں کہیں نیند بھلا آتی ہے

آہ کے ساتھ نکلتا ہے جو کچھ دل کا غبار
جا کے گردوں پہ بھی وہ خاک اڑا آتی ہے

نہ تھمی عمرِ رواں اٹھ کے پھر کشا رہا دل
سچ کہا ہے کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

رحمتیں وادیِ غربت میں بھی تو نے بخشیں
چھاؤں پر سبزہ پہ جنگل کی ہوا آتی ہے

بندگی و بیدلی نے پری شیشہ میں — ایک آفت کا یہ پتلا نظر آتا ہے مجھے

سن نہ لے وہ نقش پا زمیں کی آواز — جان دیتے ہیں بھی کھٹکا نظر آتا ہے مجھے

در مقصود کا کیا خوب شگون ہاتھ آیا — کف افسوس ہتھیلا نظر آتا ہے مجھے

دعوی بینش جفا اور تمہارے آگے — آئینہ آنکھ کا اندھا نظر آتا ہے مجھے

حسرت دید سے جاں آ جو گئی آنکھوں میں — دم نکلنے کا تماشا نظر آتا ہے مجھے

داغ کو کیوں نہ کلیجہ سے لگائے رکھوں — ایک دل سوز تو اپنا نظر آتا ہے مجھے

اے غم یار لہو میرا سکھانے والے — دل میں کچھ خون تمنا نظر آتا ہے مجھے

شہرہ ہی شہرہ ہے ہستی کا یہاں نام ہی نام — بیضہ جرح میں عنقا نظر آتا ہے مجھے

جس جگہ مہر نبوت نے شرف پایا ہے — آپ ہی کا نقش کف پا نظر آتا ہے مجھے

ناز انداز ستم عشوہ کرشمہ حیدر

جو ہے وہ خون کا پیاسا نظر آتا ہے مجھے

۲۰۱ ——— فعلاتن فعلاتن فعلن ——— ۱۲

حسن پہ خلق خدا لوٹ گئی — وہ ادا کی کہ قضا لوٹ گئی

حال پر اس کی قیامت اٹھ کر — مثل نقش کف پا لوٹ گئی

ذرہ کی طرح اٹھا میرا غبار — دو قدم چل کے ہوا لوٹ گئی

سکتے ہم سے کوئی انداز سوال — عرش پر جا کے دعا لوٹ گئی

بعد میرے کوئی پرساں نہ ہوا — قبر پر آ کے وفا لوٹ گئی

دیکھنا وار ادا کا اوس کی | ساتھ بسمل کے قضا لوٹ گئی
وہ جو مستانہ چمن سے گذرا | شاخ گل موج صبا لوٹ گئی
دیکھنا جذب دل زار مرا | کشش کاہربا لوٹ گئی
واہ رے حسن پہ دوش و کمر | دیکھ کر زلف دوتا لوٹ گئی
چھاؤں آئی ترے کوچہ میں جو دھوپ | خاک پر مثل ہما لوٹ گئی
چاندنی تا سر دیوار آکر | دیکھ کر جوش صفا لوٹ گئی

آج سن کر ترے نالے اے نظم
بلبل نغمہ سرا لوٹ گئی

٢٠٢ — مفاعلن فعلن فعولن دو بار — ٢٢

خبر ہوئی خود بخود یہ دل کو دہر دار الاماں نہیں ہے
خوشی یہ کیونکر ہوئی ہے دانہ مرا ٹھکانہ یہاں نہیں ہے
وہ عندلیب اسیر ہوں میں جسے گراں فغاں نہیں ہے
قفس میں نقش قدم لگا کیا ہوں قفس ابھی تو یہاں نہیں ہے
کبھی نہ کیں میں نے دل سے باتیں کہ میرا راز داں نہیں ہے
نہ حرف مطلب زباں تک آیا کہ یہ مری ہم زباں نہیں ہے
یہاں سے جانے کا نام آنا فریب میں دیکھ آ نہ جانا
طلسم ہے رہ گزار ہستی غبار ہر کارواں نہیں ہے

نہ جذب وہ کہربا میں پایا نہ رنگ وہ بیاختا میں پایا
کہاں کہاں میں نے جا کے ڈھونڈا دل و جگر کا نشاں نہیں ہے

نجانے ضبطِ فغاں نے کیونکر غمِ دروں کو چھپا کے رکھا
حریرِ رنگِ پیالہ میں تو کہیں وہ شعلہ نہاں نہیں ہے

ادھر جوانی کی شام آئی ادھر ہوئی صبحِ عہدِ پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے

نہ کوئی اعلیٰ نہ کوئی ادنیٰ کہ ہے مساوات انتہا تک
جہاں کہ ہم سب ہیں رہنے والے زمیں نہیں آسماں نہیں ہے

اگرچہ ہے بے ثبات عالم ٹھہر کوئی دم تو اور شبنم
ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

کمندِ فکرِ بلند سے جب فضائے خاطر کو ناپتا ہوں
تو کہتی ہے شانِ لاتناہی کہ اس کی حد لامکاں نہیں ہے

سہیل و شعریٰ و نسرِ طائر ہیں خطِ ساغر میں ڈھونڈ لیتا
اگر یہ پیرِ مغاں نہ کہتا کہ یہ خطِ کہکشاں نہیں ہے

برا جو کہتا ہی کہہ لے واعظ برا نہ مانیں گے رند ہرگز
کسی سے دل میں ملال رکھنا یہ رسمِ دیرِ مغاں نہیں ہے

چمن میں آ کر یہ میں نے جانا ہو اتفاق اصل شادمانی

یہ دو ہوائیں بھی کیا ہیں مل کر یہ نہر آب رواں نہیں ہے
کمند موج شعاع پا کر چلی سوئے اوج مہر شبنم
سپہر رہ رہ گیا تڑپ کر کہ وہ دل نا رسا یہاں نہیں ہے
یہی تو ہے اس کا آستانہ نہیں بہت دور ہم کو جانا
وہ سامنے لامکاں نہیں ہے وہ طاق کہکشاں نہیں ہے
جھلک دکھاوی نہ بھی کسی نے اپنی کہ جوہروں میں چھپا ہے عالم
فضائے آئینہ ہو اور اس میں وہ طوطی پرفشاں نہیں ہے
نہ اف کرو نگاہ کو دیکھو چھری جگر پر لگا کے دیکھو
مجھے ملال ستم نہیں ہے مجھے مجال فغاں نہیں ہے
نگاہ آبستن ہوس ہے۔ ہوس ہے آلودہ مناہی
تو اس سے بہتر ہے کم نگاہی کہ کچھ تماشا یہاں نہیں ہے
بلا کے ہم کو اے مسافر چلا شب تار میں کدھر تو
کہ غول صحرا کے شعبدے ہیں یہ آتش کارواں نہیں ہے
بھلا ہو نادان واعظوں کا کہ میکدے کو کیا ہے رسوا
وگرنہ بادہ کشی کا چرچا کہاں نہیں تھا کہاں نہیں ہے
مقام تسلیم میں پہنچ کر اثر نہ خوف و رجا کا دیکھا
سنا یہ کرتے تھے واعظوں سے بہشت میں خوف جاں نہیں ہے

یہ کیسی اے نظمؔ چپ لگی ہے کہیں نہ رسوا کرے یہ تجھ کو
کوئی خموشی نہ ہوگی ایسی کہ جس میں کچھ داستاں نہیں ہے

۲۰۳ — مفاعیلن مفاعیلن فعولن — ۳۲

پھرا ساقی کس آبِ آتشیں سے
کہ چھلکا خون رنگِ ساتگیں سے

یہ کاوش خارِ صحرا در پئے ہے
چھٹا دامن تو اُلجھا آستیں سے

فلک شرما گیا اس کی جبیں سے
نہ بائے چاند زلفِ عنبریں سے

کبھی دیکھو ادھر بھی آنکھ اٹھا کر
اجازت لو نگاہِ شرمگیں سے

فلک دیتا رہا سرمایۂ دہر
نہ اپنا ہاتھ نکلا آستیں سے

کشیدہ رہ نہ یوں اے دامنِ یار
لپٹنا سیکھ زلفِ عنبریں سے

مبارک نیم بسمل ہو کے مرنا
چھری پھرتی ہو دستِ نازنیں سے

قصاص آخر لیا قاتل سے میں نے
اُسے مارا نگاہِ واپسیں سے

سفر کا میری قصہ مختصر ہے
کہیں جاتا ہے آیا ہوں کہیں سے

بہت نازک ہوا ہے ناصح مرا دل
کہیں ٹوٹے نہ حرفِ دلنشیں سے

پلٹ جاتا ہے فوراً بات کہہ کر
یہ عادت سیکھ لی ہم نے نگیں سے

بتا کس خوں سے گرفتہ پر غضب تھا
لہو ٹپکا نگاہِ خشمگیں سے

سبب گردوں کے خم ہونے کا یہ ہے
کہ جھک کر توڑتا رہتا زمیں سے

شرارِ عشق دامن جھل کے بھڑکا
چراغِ عقل گل کر آستیں سے

جلا دے نظم آئینہ پر اپنے
ہوئی گرد نگاہ عیب بیں سے

۳۰

خیالِ چشمِ فتاں ہر گھڑی ہے
لب اوس کا پھول کی اک پنکھڑی ہے
چلو صحرا کو یہ دہن ہر گھڑی ہے
یہ غمزہ زلف و رخ پر یاد رکھنا
نہیں رنگ چمن کو پائداری
دلِ غمگیں مرا وہ کر گیا ہے
نظر کیا جانے شوخی اوس ادا کی
جلا جاتا ہوں میں غم ہو کسی کو
[illegible] پھر تو ہے پیری ہی پیری
مجھے تاثیر اس نازکی سے
وہ آئے شمع بالیں پہ میری
نہیں سمجھے وہ مجھ کو نیم بسمل
بھلا تم اور چرانا دل کسی کا
[illegible]

۲۴

اجل سچ کہتے ہیں سر پر کھڑی ہے
گراں جس پر کہ ہستی کی گھڑی ہے
یہی تدبیر مجھ کو بن پڑی ہے
کسی کا دن کسی کی شب بڑی ہے
یہ سمجھو فصل گل اک پھلجھڑی ہے
کہ لاش آرزو جس میں گڑی ہے
کہ یہ تلوار تو دل پر پڑی ہے
کوئی پوچھے کہ تجھ کو کیا پڑی ہے
غنیمت ہے جوانی جو گھڑی ہے
مری جب پڑی اوچھی پڑی ہے
یہ ساعت کیا ہے اچھی گھڑی ہے
تمہاری دل لگی تو دو گھڑی ہے
سرا سر جھوٹ ہے اور دھڑی ہے
کہ شاید دل پہ تیری رحمت بڑی ہے

شہنشاہوں سے بگڑا رہتا ہے وہ | جسے تیری فقیری بن پڑی ہے
الٰہی تو دلِ بے آرزو دے | مجھے حسرت میں حسرت یہ پڑی ہے
مرے پاس آتے آتے رک رہے وہ | اسی سے سانس سینہ میں اڑی ہے
جہالت میں سلوکِ راہِ عرفاں | اندھیری رات ہے منزل کڑی ہے
میں پہلی ہی اسیری سے تھا سمجھا | کہ بابا عاشقی کا ہتکڑی ہے
نکالیں تو قدم وہ گھر سے باہر | قیامت ہاتھ باندھے ہی کھڑی ہے
متاعِ صبر پھونکی سوزِ غم نے | یہ چنگاری کہاں جا کر پڑی ہے
گناہوں کی گھٹائے جائیں گے سائے | سنا ہے دھوپ محشر کی کڑی ہے
نہ ہو بیزار مجھ سے تو اے قبر | مری صورت گلی ہے پاس ہی ہے

وفا کہتی ہے اب [illegible] جا
ادا کہتی ہے ایسی کیا پڑی ہے

۱۹ ——— ۲۰غ

وہ آئی فوجِ گل وہ برق چمکی | وہ اٹھی آتی ہے بیرق علم کی
مجھے خواہش ہے ساقی جامِ جم کی | بھلا ہو خیر تیرے دم قدم کی
یہ کہتی ہے صفِ مژگاں صنم کی | کہ راہیں بند ہیں دیر و حرم کی
تو دیکھ لے نقشِ پا اون شوخیوں کو | تری آنکھوں میں خاک اوس کے قدم کی
[illegible] کھلا رہا ہے لالہ و گل | یہ لاشیں ہیں شہیدانِ ستم کی

سمجھ لے ہاتھ پھیلانے سے پہلے — چلیں گی برچھیاں لا و نعم کی
مجھے غش میں پڑا رہنا ہے بہتر — ہوا ہے گرم دامان کرم کی
ہمارے دور میں بھی ہے وہی جام — خرابی کی ہے جس نے ملک جم کی
جو میری طرح سے کھینچا دم سرد — تو سانس اکھڑی نسیم صبحدم کی
نہ کیوں قسمت پہ اپنی ہوں میں نازاں — اگر گنجائش نہیں ہے بیش و کم کی
نہ رکھنا زیست میں دم کا بھروسا — کسی نے کیا وصیت مرتے دم کی
وطن کو مڑ کے غربت میں جو دیکھا — تو اک زنجیر تھی نقش قدم کی
یہ دل ہے اور تیری عشق کا داغ — قسم ہے مجھ کو قندیل حرم کی
ہوا چھپ جائے تو چھپ جائے لیکن — ادا چھپتی نہیں اہل کرم کی
رہائی دام گیسو سے ہوئی یوں — چھٹیں نبضیں اسیران ستم کی
وہ دل آفت زدہ وہ کوچۂ زلف — وہ تاریکی وہ راہیں پیچ و خم کی
گریباں تک نہ پہنچا ہاتھ اس کے — پشیماں ہو کے بھی گردن نہ خم کی
ضرور اب اعتبار آئے گا سب کو — قسم کھاتے ہیں وہ جھوٹی قسم کی

حذر لازم ہے بدگویوں کی اے نظم
کہ ہے کالی زباں میرے قلم کی

۲۰۶ —— غزل مشاعرۂ یمین السلطنت ذو الوزارتین دولت آصفیہ ——

چہ سامان سیہ کاری نہ کردی — ولے کردی و پنداری نہ کردی

دریں گلشن بسانِ نکہتِ گل
ز خود رفتی و خود داری نہ کردی

ورش از دیدۂ تو دور تر بود
باندازہ تحمل سازی نہ کردی

حسرت یار مصاحبی پریشاں بد
چرا انجم سبکساری نہ کردی

خلاف از آبروئے عشق آری ایں
چو بست اشک غم جاری نہ کردی

ازیں خوابِ گرانِ غفلت آوائے
تو گاہے قصد بیداری نہ کردی

بریں عقلِ تو داغ آفریں است
کہ غم خوردی و غمخواری نہ کردی

من از تو ایں تمنا ہر دم دارم
کہ دل بردی دل آزاری کردی

خدا کرا کند کہ راز عشق را فاش
تو در مستی و ہشیاری نہ کردی

[illegible] کرا کند کہ دراں کوچۂ عشق
لحاظِ ذلت و خواری نہ کردی

شدہ زار از عنایت ہائے شاکر
کہ پنہانش ز بسیاری نہ کردی

خداوند است آمرزندۂ ظلم
نہ کردی بیش او زاری نہ کردی

مفاعیلن چار بار

۲۰۷ — ۱۴

تجھی بھلا مرا بوئے گل و رنگ گلستاں سے
رہا آوارہ مثلِ گرد باد اٹھ کر بیاباں سے

تجھے بے باک بکھری کاکلیں سر کا ہوا آنچل
لڑانا اس طرح آنکھ آئینہ کی چشمِ حیراں سے

غلامی کرکے شاہی مصر کی پائی تو کیا پائی
نہ یوسف کو مناسب تھا نکلنا چاہِ کنعاں سے
ہوا سے کھل رہے ہیں پھول یا یہ ماجرا دیکھا
کہ جاتے ہی تری اوٹھنے لگے شعلے گلستاں سے
تڑپ تجھ میں نہیں اے آہ گرنا دیکھ بجلی کا
اثر تجھ میں نہیں اے درد اوٹھنا سیکھ طوفاں سے
جہاں فانی ہی لیکن ہے دلیل ہستی باقی
وجودِ سایہ ہو جس طرح خورشید درخشاں سے
ہوا دل غم سے پھر اضطراب اب بھی نہیں جاتا
بچانا شیشۂ ناموس یارب سنگ لرزاں سے
مجھے نشو و نمائے تختۂ سوسن کا شک گزرا
وہ اک پرواز تھی طاؤس کی صحنِ گلستاں سے
عجب کیا نرگسِ بیمار کی آنکھوں میں نور آنے
یہ بادل ہے کہ سرمہ اوٹھ کر آیا ہے صفاہاں سے
میں اہلِ ہوش کی اس چارہ سازی کا ہوں شیدا
بنائیں طوق اوس سے گھٹ رہا ہو دم جس کا گریباں سے
ادب کا ہے تقاضا ہاتھ میرے باندھ دو کوئی

انھیں خو ہے الجھ پڑنے کی ناصح کے گریباں سے

نگاہِ غور کی جس شخص نے اپنی حقیقت پر
تو شرما کر نہ پھر اس نے اٹھایا سر گریباں سے

لباسِ سیل ہم قطع تعلق کرتے رہتے ہیں
بہ شکلِ موج گر پیدا گریباں ہو گریباں سے

پلا پھر نظم کو جامِ جنوں انگیز اے ساقی
کہ دردِ سر ہو خمیازۂ چاک گریباں سے

۱۷ ولہ ۴۰۸

نہ اب نکلوں گا ساری عمر کوئے مے پرستاں سے
کہ دیکھی میں نے ہمدردی یہیں انساں کو انساں سے

ملا ہے گل فشانی کا سبق مجھ کو گلستاں سے
گہر ریزی مرے خامہ نے سیکھی ابرِ نیساں سے

ہر اک ذرہ یہ چشمک جھانک کر روزن سے کرتا ہے
کہ میں واقف ہوں تحلیل شعاعِ مہرِ تاباں سے

سماں اب تک شبِ عشرت کا پھرتا ہے نگاہوں میں
نکل آنے کو تھی سلمائے فطرت خود شبستاں سے

غلط ہے اس سرا میں راحلہ ہستی کا کب ٹھہرا

مگر ہاں کچھ پتا ملتا ہے اس کا گردِ جولاں سے
اثر تا عرش پہنچا اک نگاہِ حسرت آگیں کا
تلاطم پڑ گیا ہے جنبشِ دامانِ مژگاں سے
ہوا انساں کبھی ممنونِ منت ایسے ویسوں کا
زمیں پر گر گیا ہوں میں فلک کے بارِ احساں سے
سکھئے دیتی ہے بنجو دیکھئے گل ہاتھوں میں ہے رشتہ
سنبھل اے باغباں گرنے نہ پائیں پھول داماں سے
شکستِ مدعا کا سامنا ہے دونوں جانب سے
کسی کا دل ہے نازک تر کسی کے عہد و پیماں سے
رخِ روشن پر اک خالِ سیہ میں دیکھ کر سمجھا
عروجِ ماہ میں اوترا ہے تارا اوجِ کیواں سے
پتہ ملتا نہیں راتوں کو اب خوابِ پریدہ کا
غرض کیا طائرِ شبگیر کو فکرِ شبستاں سے
ور اہلِ کرم سے راہ چلتے فیض پاتے ہیں
صبا اکثر معطر ہو کے نکلی ہے گلستاں سے
ٹھکانا اور بھی کوئی ہے کیا خانہ بدوشوں کا
اِدھر جاتا ہوں دیکھیں گردِ باد اُدھر بیاباں سے

۲۱۰

اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوئے سب پہلی منزل سے
خدا معلوم دو دو اشک بھی نکلے تھے کس دل سے

سنا جادو کو چل جاتے ہوئے کاجل کے بھی تل سے
نکل آیا ہی ایک اتنا سا فتنہ چاہِ بابل سے

اسیری میں بھی آزادی میں بھی رونا رہا ہم کو
قفس میں آئے بھی مشکل سے پھر نکلے بھی مشکل سے

رہا پیت کشت زار آرزو کی سعی بے جا سے
وہی اچھے رہے کچھ ہاتھ دھو بیٹھے جو حاصل سے

فلک کی گردشیں ہیں اور جائے امن ناپیدا
بھنور میں کشتیٔ عمر رواں ہے دور ساحل سے

نہیں بحر فنا میں ڈوب مرنے کے سوا چارہ
ملا پانی نہ چلو بھر کسی پیاسے کو ساحل سے

ہزار آنکھوں سے فلک ہی تیرے کشتے کی تماشائی
ستارے جھلملے ہیں آئینہ داری بسمل سے

تعلق سے جہاں کے اس طرح آزاد ہو جا تو
نکل جاتا ہے نالہ جس طرح طوق و سلاسل سے

میں اک افسردہ دل ہوں جاؤں کیونکر بزمِ عشرت میں
چمن میں بج رہا ہے ارغنونِ صوتِ عنادل سے

میں اک شوریدہ سر ہوں مجھ کو لے جاؤ نہ دریا پر
نہ دیکھا جائے گا موجوں کا ٹکرانا بھی ساحل سے

شبِ غم میں ہوا ہے تجربہ یہ بارہا مجھ کو
اجل آتی ہے آسانی سے نیند آتی ہے مشکل سے

ذرا تو ہی بتا دے اے ستم جاؤں کہاں بیٹھوں
جدا ہو کر ترے در سے نکل کر تیری محفل سے

حدی خواں دیکھنا ایسا نہو پامال ہو جائے
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی جاتے ہیں محمل سے

غبار اپنا فلک فرسا رہا شاہد ہے خود گردوں
کبھی دب کر نہیں رہتے کسی مدِ مقابل سے

کبھی چھوڑا نہ ہم نے شیوۂ اہلِ مروت کو
کبھی جھپکی نہ اپنی آنکھ دشمن سے نہ قاتل سے

جو ہیں بیدردان کا ذکر کیا جو چاہیں وہ سمجھیں
تراوش و جلکی بھی ہے پرافشانی بسمل سے

بڑے ہشیار ہیں اہلِ کرم بھی یہ مرا تو قائل ہوں

نہ قصر دلکشا رکھے نہ باغ جانفزا رکھے
تری جاگیر تو یہ ہے کسی کے دل میں جا رکھے

غرض اس پیر زال دہر سے کس کی بنا رکھے
نہیں میں نازکش اس کا یہ نازلیے اوٹھا رکھے

رگ گردن پہ جس کو ناز ہو تو جھک کے مل اوس سے
یہ دارا ایسا ہے جو تسمہ نہ گردن میں لگا رکھے

غم و شادی کو میں ایسا ہی سمجھا جس طرح کوئی
لگائے خون دامن میں کہ ناخن پر حنا رکھے

وہ حاضر ہے جدھر چاہے اودھر سجدہ کرے انساں
وہ ناظر ہے جدھر چاہے اودھر دست دعا رکھے

گواہی دے رہے ہیں روز محشر دست و پا جن کے
یہ حال اپنوں کا ہے غیروں سے پھر امید کیا رکھے

یہ کہہ کر ہاتھ دیتا ہے اوٹھا یا اہل ہمت نے
مناسب ہے روا اس کے واسطے نیچی کبھی اوٹھا رکھے

تری سرکار سے میں تو نہ حاجت لیکن کہہ بیٹھا
تجھے اکبر ساری خلق کا حاجت روا رکھے

فقط دو قرص ناں ہیں نعمت خوان سپہر گردوں میں
اگر کھائے تو کیا کھائے اگر رکھے تو کیا رکھے

براق آیا زمیں پر عرش سے اور عرش پر پہنچا
فلک کو رہ گئی حسرت قدم یہ بار دیا رکھے

نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع گردوں لاکھ درپے ہو
اسیر قید غم رکھے گرفتار بلا رکھے

لحد میں مال و زر کچھ کام آئیگا نہ منعم کے
جسے خود کھود کر گاڑا ہو امید اوس سے کیا رکھے

کسی کے کوئی کام آتا نہیں وہ وقت کیا ہے
کہ انساں ہاتھ سے اپنے لحد اپنی بنا رکھے

جہاں میں آئے ہیں تنہا ہی اور تنہا ہی جاتا ہے
بشر کا ہے کو دو دن کے لئے جھگڑے لگا رکھے

کسی کو ملک و مال آساں نہیں دیتا کبھی گردوں
اگر یوسف بھی ہو پہلے کنوئیں اوس کو جھنجھلا رکھے

۱۱

ولہ

۲۱۲

میں ہوں بندوں میں اوسکے جو محبت کی نظر رکھے
میں احساں عمر بھر مانوں وہ احساں عمر بھر رکھے

ہمیشہ انتظارِ آمدِ بادِ سحر رکھے
بھروسہ زیست پر مثلِ چراغِ رہگذر رکھے
یہاں جو خار ہے دامن کشِ برقِ تجلی ہے
قدم راہِ سلوک و معرفت میں دیکھ کر رکھے
جو محرم ہو نہ راہ شوق کا اوس کو یہ مشکل ہے
نظر بھی سوچ کر ڈالے قدم بھی دیکھ کر رکھے
نزاکت راہ چلنے کو ہے مانع بات کرنے کو
حسیں ہو کر بھلا کچھ تو دہن رکھے کمر رکھے
سکھاتا ہے غرورِ حسن یوں عاشق کشی اوس کو
زمیں پر پاؤں کیوں کھو کہ وہ قد ہو تو سر رکھے
دبستانِ وفا سے پڑھکے یہ دو حرف میں نکلا
کسی کا ہو رہے تو یا کسی کو اپنا کر رکھے
کبھی شرمندہ ہو اس تختۂ نرد دہر میں پھنسکر
نکل جانے کو اپنے راستہ چلنے کو گھر رکھے
صدا ہے طائرِ قبلہ نما کی پرفشانی میں
فلک دے لاکھ گردش منہ جدھر رکھے اودھر رکھے
بہت سے دل میں ہیں مضمون جو اب آتے جاتے ہیں

مناسب ہے مجھے بھی ساتھ اپنے نامہ بر رکھے

قدح کش نظم ہے لیکن نہ ایسا بھی کہ اے واعظ

شراب کبر و نخوت شیشۂ توبہ میں بھر رکھے

۲۱۳

ملا تھا ایک ساغر زہر غم سے نیلگوں وہ بھی

ستم ہے اوس پہ تعزیرائے فلک حد سے فزوں وہ بھی

اثر ہوتا نہ ہرگز اہل دل پر صور محشر کا

صدائے چنگ ہو گئی یا صدائے ارغنوں وہ بھی

بہار باغ اک ہنگامہ ہے چاک گریباں کا

جسے ہم جوش گل سمجھے ہیں جوش جنوں وہ بھی

کہیں کوتاہ تھا جو سر پہ اپنے اور زیبا تھا

ہوا ہے تا قمر کی خواہش میں لیکن سرنگوں وہ بھی

ہدف ہونے سے دل کو کس طرح کوئی بچا لیتا

نگاہ اس کج ادا کی اور نگاہ پر فسوں وہ بھی

تڑپ کر دل جو رہ جاتا تھا سہارے وہ تو پاتا تھا

قیامت تھی مجھے اک فرقت صبر و سکوں وہ بھی

نمایاں کرنے پر اوس وادی میں یا تیر بھی سے آ جاوے

چھپے رہتے مرے دل میں بن گئی سوزِ دروں وہ بھی
جہاں ہے وارِ ماتم شیوۂ گردوں سے ظاہر ہے
کہ پہنا ایک ہی خرقہ ہمیشہ نیلگوں وہ بھی
ملے دنیا بھی اور عقبیٰ بھی یہ تو ہو نہیں سکتا
کہے جاتی ہے لیکن حرص میری نہ کبھی ہاں بھی
تباہی میں کبوتر کی طرح تھا کوکبِ طالع
ہوا آخر شکارِ پنجۂ بختِ زبوں وہ بھی
کسی عیار نے باتیں بنا کر لے لیا دل کو
فسانہ میں تو سمجھا تھا مگر نکلا فسوں وہ بھی
نہیں اب دادخواہی کی ہوس اے داورِ محشر
کہ میں بھی ہوں پشیماں شرم سے ہے سرنگوں وہ بھی
مجھے سوزِ سیہ میں سایہ اپنا یاد آتا ہے
کہ میرے ساتھ تھا آوارۂ دشتِ جنوں وہ بھی
کہوں قصے میں واعظ عنوانِ نوجوانی کا
حدیثِ عیشِ قدسی کہتا تھا خیر القروں وہ بھی
کوئی حرفِ تمنا ضبط کرتا ہوں جو اے حیدر
تو آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے بن کر اشکِ خوں وہ بھی

ملی تھی راہ میں منزل سراب عمر فانی کی
یہاں نقش قدم سے اپنے تو نے کیا نشانی کی
صدا یہ آ رہی ہے دور سے برگ خزانی کی
کبھی ہم نے بھی لوٹی تھیں بہاریں زندگانی کی
کسی پر دل کا آنا موت تھی عہد جوانی کی
نہ بھولوں گا اسے یہ جان ہے ساری کہانی کی
کرامات صفائے قلب کو پوچھو تو شبنم سے
فروغ شمع قستاں لے اوڑی آگ بوند پانی کی
تجلی بھی ہوئی آخر تو موسیٰ نے نہ کچھ دیکھا
چکا چوند ایسی تھی آنکھوں میں برق لن ترانی کی
غبار راہ اٹھ کر مرا منزل کی جانب چند گام آیا
یہ ٹھوکر پڑ گئی کس رہ نورد کاروانی کی
کوئی حد بھی ہے پستی کی ہزاروں سال جیتے رہے
تو ہم تک روشنی پہنچی ہے شعر لے بیانی کی
بگولوں میں نظر آتی ہے خاک باد گی گشتی
عیاں ہے برق باراں سے لڑائی آگ پانی کی

خیال آیا نہ مجھ کو حیف بعض الظن اثم کا
پشیماں ہوں کہ ناصح سے میں نے بدگمانی کی

حکومت کا مزہ ہم نے اوٹھایا پڑھ کے شاہوں سے
کہ اپنے نفس سرکش پر ہمیشہ حکمرانی کی

خجالت سے خضر کا منہ چھپانا ہی مناسب تر
کہ خواہش اور پھر وہ بھی حیات جاودانی کی

علم رکھتا نہیں گر تو قلم سے نام پیدا کر
مقام رشک ہی شہرت درفش کاویانی کی

یہ ہے نادر مرقع کارگاہ نظم کا حیدر
کہ ہیں لفظوں کے آئینہ میں تصویریں معانی کی

۲۱۵ — ولہ — ۱۱

بڑا غم ہوگا قتل عاشق ناشاد و مضطر سے
یقیں ہے تیغ قاتل خون روئے چشم جوہر سے

بجھایا حسن دنداں ہی لب نازک کی خوبی کو
بجھادی آتش یاقوت تو نے آب گوہر سے

خرام ناز تیرا دیکھ کر ایسا عرق آیا
کہ آخر نقش ساری دھو گئے طاؤس کے پر سے

جو نازک طبع ہیں وہ سخت دل کے منہ نہیں لگتے
نہ باور ہو لڑا کر دیکھ لو شیشہ کو پتھر سے

حسینوں کی نزاکت دیکھ کر دھوکا نہ کھا جانا
کہ رخسارے تو ان کے پھول سے ہیں دل ہیں پتھر سے

خدا کے سامنے ہوگا خرام ناز کا شکوہ
گواہی دل کے پس جانے کی لینگے اہل محشر سے

اگر اونکی طرح میری پلک جھپکی ہو تو کہہ دیں
لڑائی آنکھ میں نے رات بھر ایک ایک اختر سے

کرامت تو نے رندوں کی نہیں دیکھی ہے اے زاہد
بڑھا کر ہاتھ بھر لیتے ہیں ساغر حوض کوثر سے

اثر دیکھے کوئی بیتابی دل کے مضموں میں
مرا مکتوب آگے جاتا ہے بال کبوتر سے

کسی کے شوق آرائش نے کی غارتگری کیسی
لیا اشتاق سے دل آئنہ چھینا سکندر سے

مروت نام کو تجھ میں نہیں اے برق کیا کہنا
لگا دی آشیاں میں آگ ورنہ تھی ہما و پر سے

پری تھی آئینہ خانہ میں عکس حسن دلبر سے
صدا پرواز کی آئی پرافشانی جو ہر سے
سنو تم وصف سے ہم سے سنا ہے نے پیمبر سے
پیمبر سن کے آتے ہیں زبان موج کوثر سے
جنوں میں سر کو ٹکرانا کبھی خالی نہ جائے گا
پری شیشہ سے اور شیشہ نکل آئیگا پتھر سے
سبک سر ہو کے جو خفت اوٹھائی ہے نہ کچھ پوچھو
گیا میں ڈوبنے پانی نہ اونچا ہو سکا سر سے
کھلا جب سے کہ سب تیرے اشارے کی کرشمے ہیں
جگر کو تیر سے اک عشق ہے گردن کو خنجر سے
سنبھل کر ہر قدم راہ وفا میں چاہیئے رکھنا
کہیں دیوار بن جائے نہ اوٹھ کر گرد ٹھوکر سے
شب یلدا مری آبستن صبح قیامت ہے
مجھے محشر کے فتنے جھانکتے ہیں چشم اختر سے
صبا نے اے گل تر کوئے تیرے جو اس آ کر خبر
کہا راز نہفتہ فاش اور ہنستا ملا پر سے

سویدا ہے دل سوزاں سی کیا اسپند کو نسبت
کمال ضبط تو یہ ہے دھواں اٹھے نہ مجمر سے

نگیں میں دیو نہنگ تیز دنداں جاتا ہوں میں
عبث ہے فکر اب پانی تو اونچا ہو چکا سر سے

جو ہو حاصل دل روشن نہ کر لاف نسب ہرگز
صفا میں آئینہ کی فرق آ جاتا ہے جوہر سے

غنیمت کیوں نہیں سمجھو دل پر درد کو حیدر
کہ یہ دولت جو ملتی ہے تو ملتی ہے مقدر سے

۲۹ ولہ ۲۱۷

شب مہ میں اگر یاد آئے فلک و آفتاب آئے
یقیں ہے ترمن مشک تو برق اضطراب آئے

شب غم میں کبھی پہلو نہیں ممکن کہ خواب آئے
تو کیوں کروٹ بدلوانے کو جوش اضطراب آئے

بنا کب مشک تر بالوں پہ گو رنگ خضاب آئے
نہیں ممکن جوانی کی سی رخ پر آب و تاب آئے

مروت اس سے ظالم کو نہ کچھ شرم و حجاب آئے
جو کچھ کہئے تو سیدھی بات کا الٹا جواب آئے

روانی عمر کی ہے وادیٔ ہستی میں سیل آسا
حباب و موج کے مانند ہم پا در رکاب آئے
بڑھاتا ہے عبث تو ہاتھ دنیا کی طرف ناداں
خبر لے ہوش کی مستی میں کیا ہیچ سراب آئے
ترش روئی کی عادت تلخ کامی سے ہوئی پیدا
ہمارے سامنے ہو جائے گر کوثر شراب آئے
نکلتا ہے اشارہ جھلملانے سے ستاروں کے
ازل کے روز سے لے کر دلِ پر اضطراب آئے
میں کیا جانوں گنہ لے کاتبِ اعمال کہتے ہیں
یہ جھگڑے اوس سے کر جس کو حساب آئے
عناں گیر اوس کے توسن کا ہو جذبِ شوق آتا ہے
غبارِ ناتواں تا حلقۂ چشمِ رکاب آئے
اون کی بھی جذبِ اک نگاہ اتنے کرشمہ کیوں
حیا آئے حجاب آئے غضب آئے عتاب آئے
ترے کہنے سے میں توبہ تو کر لیتا ہوں اے واعظ
رہا جاتا نہیں پھر جھوم کر جس دم سحاب آئے
ہوا ہے سرد نہری چل رہی ہے سامنے ناظر ہیں

نہ ٹھہرا تا ہوا وقت سحر کیوں آفتاب آئے

فسانہ کی عوض لے داستاں گو پڑھ کوئی افسوں
اوتر آئے پری شیشہ میں گر آنکھوں میں خواب آئے

جہاں میں سرکشی کی ہم نے اس پر بھی شرارکسا
سراپا اضطرار آئے ہمہ تن اضطراب آئے

ملانا آنکھ پھر منہ پھیر کر تیوری چڑھا لینا
یہ مطلب ہے چھری وہ ادا ہے جس کو نہ تاب آئے

ہوا ثابت یہ جب دونوں کی ہستی اعتباری ہے
نہ کیوں گردوں سے پھر آنکھیں لڑانے کو حباب آئے

نہ آئے وہ ستمگر اور بہار اس طرح سے گذرے
تڑپ کر برق سی رہ جائے گھر گھر کر سحاب آئے

نگاہِ شوق کے چلتے گیا صبر و قرار آخر
اسی رستہ سے شاید کاروانِ اضطراب آئے

نشاطِ عالمِ فانی ہے توام رنج و حرماں سے
مجھے چشمِ پرخوں اوس کو گر جامِ شراب آئے

گذرتا ہے کچھ اس انداز سے لشکر حوادث کا
کہ اوڑ کر سر پہ گردوں کے غبارِ انقلاب آئے

خدا نے کی ہے جنت واعظوں ہی کے لئے پیدا
اگر یہ میکدہ میں بھی گئے ہو کر شاب آئے

بقدر یک نگہ مہلت نہ دی جب انتظار اوس کا
تو مشکل ہے بقدر یک مژہ آنکھوں میں خواب آئے

بہت اصرار کرنے سے اوٹھائی تو ہے آنکھ اوس نے
مگر چتون یہ کہتی ہے کہ آئے اور حجاب آئے

اگر سو قرن آئے بہار آئے آسماں تو کیا
کوئی گردش تو کر ایسی کہ پھر فصل شباب آئے

یہ راتیں ہجر کی تارے ہی گنتے گنتے کٹ جائیں
فلک سمجھوں گا میں تجھ سے ذرا روز حساب آئے

سوا شام الم کے اور کیا دیکھیں گے دنیا میں
اوٹھیں اسوقت سو کر جب لب بام آفتاب آئے

حذر ہے زاہد سالوس سب کو تیرے سایہ سے
اگر آئے تو تھراتا ہوا تیر شہاب آئے

رواں ہے توسن عمر اور پڑی تھم نہیں سکتی
تو پھر کس طرح قابو میں یہ اپنے شتاب آئے

۱۸ ——— ولہ ——— ۲۱۸

ادھر دل میں ہماری حسرت پہ حسرت بڑھتی جاتی ہے
ادھر شوخی پہ شوخی ہے شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمانہ میں نہ لیگا نام کوئی عشق بازی کا
ہمارا سانحہ سن سن کے عبرت بڑھتی جاتی ہے

الٰہی دل سے یار کا لگا آتش ہے پہلو میں
جو سوزش گھٹتی ہے گرد کدورت بڑھتی جاتی ہے

وہ نہیں اٹھتے اگر بیتی گھڑی اپنے جانے کی
سحر کے ساتھ چہرے کی بشاشت بڑھتی جاتی ہے

جدائی میں ہر اشک حیراں دیدہ کا عالم ہے
کہ رونق گھٹتی جاتی ہے نقاہت بڑھتی جاتی ہے

وہ باندھے جاتے ہیں لا کے تکیے کو دامن
گھٹا کے ساتھ گلزاروں کی وسعت بڑھتی جاتی ہے

اجالا گھٹتے ہی گھڑیوں کے بدلے پہر سالوں کی
کہ جوں جوں رات جاتی ہے شکایت بڑھتی جاتی ہے

نہ پوچھو ہجر کی شب دم نکلنے میں ہے کیا لذت
چلی آتی ہے جھپکی نیند غفلت بڑھتی جاتی ہے

بہار گل میں ہے طاؤس آتشباز کا عالم

چمن میں پھول پھولوں میں شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمین شعر سے کیونکر اوٹھاؤں میں قلم اپنا
کہ شل ہیکل اس کی حلاوت بڑھتی جاتی ہے

نظر آتا ہے صحرا صاف بیٹھے بیٹھے زنداں میں
ہوا کی موسم گل میں لطافت بڑھتی جاتی ہے

یہاں درگاہ میں ہر روز چلے بندھ جاتے ہیں
وہاں نام خدا ہر ایک منت بڑھتی جاتی ہے

بنا وان کا پھسکا کہنا بہار آ نی بھی جب تک
مبارک ہو انہیں مہندی کی رنگت بڑھتی جاتی ہے

بہار آئی ہے کاٹے کٹاتی ہے زنجیر زنداں میں
گریباں سے گلا گھونٹا ہے وحشت بڑھتی جاتی ہے

گلے سے میرے وہ خود آبدیدہ ہو کے لپٹے ہیں
خجل ہیں اگلی باتوں پر ندامت بڑھتی جاتی ہے

مسلمانوں کے اوس کافر ادا سے خون ہوتے ہیں
زمین کربلا کی روز قیمت بڑھتی جاتی ہے

سمجھ کر ہم کو اپنا شیفتہ شیدا ہے ناز سے
جتاتی ہیں عشق میں ہو ان کی نخوت بڑھتی جاتی ہے

پتا حیدر کا وہ دو دن نہیں ملتا احباکو
نجانے کس پہ یہ بے محبت بڑھی جاتی ہے

۲۰ ولہ ۲۱۹

بیان سوزِ غم کا ہمکو اک طومار ہوتا ہے
کلیجہ اوس کا کٹ جاتا ہے جو غمخوار ہوتا ہے
اوسی پر حضرتِ واعظ کو کچھ اصرار ہوتا ہے
جو افسانہ بعید از عقل و دور از کار ہوتا ہے
دیے جاتے ہو غیروں کو تم ساغر دئے جاؤ
عنایت مجھ پہ کیوں ہے مجھ سے کیوں اصرار ہوتا ہے
گواہی دیتی ہے چہرہ کی سرخی دیکھ لے ساقی
کہ شرمندہ ترے احسان سے میخوار ہوتا ہے
خطا کرتا نہیں گردوں سے جو تیر قضا آیا
نجانے کسکی چٹکی میں کب سوفار ہوتا ہے
ستم کا تیرے میں اے آسماں شکوہ نہیں کرتا
ترے ناوک میں اندازِ نگاہِ یار ہوتا ہے
اوسی دن سے ہوا ہے برق تجلی منتظر تیرا
کہ دیکھا میں نے گلشن میں فروزاں خار ہوتا ہے

تڑپنے لوٹنے کا تھا مزہ عہد جوانی تک
گئی فصل جنوں اب درد دل بیکار ہوتا ہے
مجھے ظل ہما کی آرزو ہرگز نہیں ہوتی
میرے سر پر جب اوس کا سایہ دیوار ہوتا ہے
مژہ اس راستی پر بھی رہا کرتی ہے کج مجھ سے
شکایت اوس کی کیا ابرو تو پھر خمدار ہوتا ہے
عیاں ہیں کامیابی ہے کرشمہ جوش ہمت کا
اگر یہ لہر آجاتی ہے بیڑا پار ہوتا ہے
ہوا ابر و بحر و بر یہ سب تیرے خزانے میں
وہ مل جاتا ہے فوراً جو مجھے درکار ہوتا ہے
تجھے دشوار سا دشوار بھی آساں سے آساں ہے
مجھے آسان سے آسان بھی دشوار ہوتا ہے
اگر دنیا سے استغنا ہو مر رہنا بھی ہے آساں
ہوس ہو گر تو جینا بھی بہت دشوار ہوتا ہے
کھلا یہ رمز تاب آفتاب و شبنمستاں سے
ٹھہر سکتی نہیں آنکھیں ہی جب بیدار ہوتا ہے
گذرگاہ فنا میں یہ تماشا دیکھتا ہوں میں

کہ تھم جاتا ہے گرد دریا رواں کہسار ہوتا ہے

قضا کس آئینہ خانہ میں دوڑاتی ہوئی لائی
بشر کو سانس لینا بھی یہاں دشوار ہوتا ہے

حذر اے آسماں کیا مرادوں کے ستانے سے
اولجھ پڑتا ہے وہ جو زیست سے بیزار ہوتا ہے

صفائے دل کو ساتھ اپنے لئے جاتا ہوں مرقد میں
کہیں اب حشر تک میلا کفن کا تار ہوتا ہے

رسائی چاہتا ہوں نظم اپنی کعبۂ دل تک
تو پہلے منزل بت خانہ پیدا ہوتا ہے

۲۲۰

بچھا دینگے غزالان حرم اپنا حرم پہلے
وہ پھینکیں تو کمند طرۂ زلف رسا پہلے

طبیعت میں کہاں تھا خود پرستی کا مزہ پہلے
بھلا آئینہ تک تھا قبلۂ ناز و ادا پہلے

نہ تھے ہم پیش ازیں آگاہ حال عشق بازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے

ہوئی ہے صبح کیا جلد آج کی شب وہ جو مہماں ہیں

وہی یہ رات ہے جس کی نہ تھی کچھ انتہا سے پہلے
بہار آئی ابھی میں نغمۂ بلبل نہیں سنتا
مبارکباد کی دے شیشۂ تو یہ صدا سے پہلے
سجانے کوئی چلے نکلے اہو عیش کا ساماں
گلے کا ہار ٹوٹے پہلے اپنی قبا سے پہلے
ہوا نے خیر کی منہ کیا دکھاتا تیرہ بختی کو
سر بالین تربت شمع سے آئی ہوا پہلے
شب فرقت میں کی اس رشک عیسیٰ نے مسیحائی
سحر کی دے گئی مجھ کو خبر باد صبا پہلے
مجھے اب تک نہیں بھولا تصور دست رنگیں کا
تمہارے ہاتھ دبا آرہا رنگ حنا سے پہلے
تمہارے جنوں اپنا بھی ہے کوہ و بیاباں کا
چلے ہم بھی نکل جانے وہ دیکھو کالی گھٹا سے پہلے
جواب فسوں طرازی کمتر اس کا ہو نہ اس کا ہے
قلم ٹوٹے مرا پہلے کہ موسیٰ کا عصا سے پہلے
زمیں سے کس طرح احباب کے کہنے سے میں اٹھوں
اٹھانا چاہیے او بے وفا کا نعش پا سے پہلے

اوڑتی ہے نسیم صبح آنچل روئے روشن سے
چھپا لے مطلع خورشید تاباں کو گھٹا پہلے

انھیں متابیوں نے اس کے کوچہ سے نکلوایا
کہ جاتے ہی اوٹھایا پردۂ دولت سرا پہلے

زباں تک بھی پہنچنا ضعف سے دشوار ہے اب تو
نکل جاتی تھی دو دو تیر تک آہ رسا پہلے

وہ کوٹھے پر چڑھینگے برق باراں کے تماشے کو
الٰہی غیر کی آنکھوں میں چھا جائے گھٹا پہلے

خضر کیا جانیں کیا لذت ہے مرنے میں حسینوں پر
پشیمانی اوٹھائی پی لیا آب بقا پہلے

برا ہوتا ہے دھڑکا ساتھ والو سے بچھڑنے کا
کبھی سننے میں آتی تھی نہ فریاد درا پہلے

سما سکتا نہیں اب پیرہن میں حسن روز افزوں
نہ یوں ہر روز ٹوٹا کرتے تھے بند قبا پہلے

شکایت کیسی اولٹی باتیں کرنا پڑیں آخر
یہ شوخی وہ سمجھے خود ہو گئے ہم سے خفا پہلے

حجاب آئے اسے کیونکر نہ شبنم کے دوپٹہ میں

کسی کی آنکھ پڑتی تھی نہ حیدر رہا بجا پہلے

ولہ

۲۲۱ ۱۲

اوڑا کر کاگ شیشہ سے گلگلوں نکلتی ہے
شرابی جمع ہیں میخانہ میں ٹوپی اوچھلتی ہے
بہارِ میکشی آئی چمن کی رت بدلتی ہے
گھٹا مستانہ اوٹھی ہی ہوا مستانہ چلتی ہے
تر خود رفتہ طبیعت کب سنبھالے سے سنبھلتی ہے
نہیں آتی ہے ناصح سے نہ کچھ واعظ کی چلتی ہے
یہ کس کی ہے تمنا چٹکیاں لیتی ہے جو دل میں
یہ کس کی آرزو ہے جو کلیجہ کو مسلتی ہے
وہ دیوانہ ہی جو اس فصل میں فصدیں نہ کھلوائے
رگِ ہر شاخِ گل سے خون کی ندی اوبلتی ہے
سحر ہوتے ہی دم نکلا غش آتے ہی اجل آئی
کہاں ہوں میں نسیم صبح پنکھا کس کو جھلتی ہے
ہمع ایک کا ہی ایک کے نقصاں سے عالم میں
کہ سایہ پھیلتا جاتا ہی جوں جوں دھوپ ڈھلتی ہے
تبار کھی ہر غم پر زیست کی یہ ہو گیا ثابت

نہ لپکا آہ کا چھوٹے گا جب تک سانس چلتی ہے

قرار اک دم نہیں آتا ہے خون بے گنہ پی کر
کہ اب تو خود بخود تلوار رہ رہ کر اگلتی ہے

جہنم کی نہ آنچ آئے گی میخواروں پہ او واعظ
شراب آلودہ ہو جو شے وہ کب آتش میں جلتی ہے

نہ دکھلانا الٰہی ایک آفت ہے شب فرقت
نہ جو کاٹے سے کٹتی ہے نہ جو ٹالے سے ٹلتی ہے

یہ اچھا شغل وحشت میں نکالا تو نے اے تنہا
گریباں میں الجھنے سے طبیعت تو بہلتی ہے

۲۱ — فاعیل مفاعیل مفاعیل فعیل — ۲۲۲

ہے قتل کو منظور کہ چھپ جائے نظر سے
گیسو کا ارادہ ہے کہ بڑھ جائے کمر سے

آنکھوں میں جو رہتے تھے وہ اوجھل ہوں نظر سے
پوچھے یہ کوئی چاہنے والے کے جگر سے

آئینے میں گر برہمی طبع ہے ظاہر
اغماض ہے انداز سے تیور ہے نظر سے

کٹ جاتی ہے آخر شب غم ہو کہ شب عیش

ہوتی نہیں کچھ رات سوا چار پہر سے

ہر اک حرکت کے لئے اک روز سکوں ہے

رفتارِ فلک کم نہیں پروازِ شرر سے

ہم بھی ہیں کھنچے سرو جو رہتا ہے کشیدہ

سایہ کے بھی طالب نہ ہوئے ایسے شہرت

میں عکس ہوں اور آئینہ ہے گوشۂ عزلت

صورت نہ دکھاؤں گا جو نکلا کہیں گھر سے

ہو جاتا ہے رخسار کدیور کا وہ غازہ

گلزار میں جو رنگ ٹپکتا ہے شرر سے

پائی نہ خبر قافلۂ عمرِ رواں کی

پھر آئے پلٹ کر یہ مسافر نہ سفر سے

سو عیب تھے مجھ میں نہ لکھا ایک بھی منہ پر

شکوہ مجھے رہ جائیگا یہ اہلِ ہنر سے

انساں وہی انساں ہے جو مشتاق ہو اس کا

کانوں سے سنا جس کو نہ دیکھا ہو نظر سے

اک دم میں بہارِ شبِ عشرت ہوئی آخر

گل ہو گئیں شمعیں نفسِ بادِ سحر سے

ہے دور میں ساغر کے یہاں جلوۂ خورشید
رندوں کا الگ دائرہ ہے دورِ قمر سے

جانے کا تری بزم سے رستہ نہیں ملتا
یہ بھی نہ رہا یاد کہ آئے تھے کدھر سے

عالم میں سخن فہم کسی کو نہیں پاتا
باتیں میں کیا کرتا ہوں دیوار و در سے

انداز نہ اپنا نگہ مست نے چھوڑا
سو شیشۂ دل چور ہوئے گر کے نظر سے

کچھ وعظ میں شوخی ہے نہ انداز میں گرمی
محروم جو ہے زاہدِ خشک آتشِ تر سے

نکلا ہوں نہ نکلوں گا کبھی کوچے سے تیرے
اوٹھا ہوں نہ اوٹھوں گا کبھی میں ترے در سے

عزلت تری ہم کو بھی پسند آ گئی اے سرو
اب ہم نے بھی دامن کو لپیٹا ہے کمر سے

پھر ساغرِ جم ہو تو نظر بھر کے نہ دیکھیں
لبریز کیا جام کو جب خونِ جگر سے

اے نظم اوٹھا زانوئے غم سے نہ ترا سر

۲۲۴ — ۲۶

چھائی ہی محبت جو دھواں دھار کسی کی
صورت نظر آتی نہیں جز یار کسی کی

عبرت مجھے ہوتی ہی پلٹنے پہ صدا کے
اک بات اُٹھاتا نہیں کہسار کسی کی

یوں مرکہ نہ یاروں کہ ہو بھاری تن امردہ
یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی

اچھی بھی گذر جاتی ہی انسان کی بری بھی
رہ جائیگی آسان نہ دشوار کسی کی

پانسے کی طرح کروٹیں لیتا ہے ستارہ
ہی جیت کسی کی نہ سدا ہار کسی کی

کہتا ہی قلم سجدوں میں جبتک کٹے عمر
کیونکر ہو زباں واقفِ اسرار کسی کی

مارے ہوئے ہیں عشق کے نرگس ہو کہ گل ہو
زخمی یہ کسی کا ہے وہ بیمار کسی کی

اوس ترک کا کھینچیں گے گریباں تہ محمل
ہاتھ آج کسی کا چلے تلوار کسی کی

سبزہ پہ بکھر جاتا ہے جب سبحہ شبنم
پڑھتا ہے وہ تسبیح لگاتار کسی کی

مرقد ہی پہ بس جاکے تھمے گا فرس عمر
کب ان کو ملے گا یہ رہوار کسی کی

بوسے ترے پیکان کے لیتا ہی کوئی زخم
پہنچی ہے مِنَّتی تا لب سوفار کسی کی

تڑپا گیا دل کو مرے بجلی کا تڑپنا
دکھلا گئی جھلکی مجھے ہر بار کسی کی

گرجی ہوئی دیوار ہی زنداں کی ہماری
زنجیر میں دیکھی ہے یہ جھنکار کسی کی

مرقد وہ جگہ ہے کہ اوتر جاتا ہی سر سے
تاج اس میں کسی کا ہو کہ دستار کسی کی

بسمل ہوا جاتا ہوں تڑپتا نہیں لیکن
تڑپوں گا جو خالی گئی تلوار کسی کی

واعظ ہو کہ ناصح ہو یہ ہے فصل بہاری
ہم رند اوٹھائیں گے نہ زنہار کسی کی

کچھ پاس ہے تم کو نہ فلک کو نہ اجل کو
آنکھوں میں مروت نہیں اب یار کسی کی

دل سے وہ باتیں میں کیا کرتا ہوں پہروں
کیا دل میں اتر جاتی ہے گفتار کسی کی

کاٹوں میں گلا ورنہ گردن پہ چلے تیغ
تقدیر سے چلتی نہیں زنہار کسی کی

پامال کرے شوق سے مجھ کو سرِ محشر
سیکھی ہے قیامت نے جو رفتار کسی کی

وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا تو چلے ہم
دیکھے گا نہ اب راہ یہ بیمار کسی کی

چھپ چھپ کے بھی دیکھوں تو جھپ جاتی ہیں نظریں
اتنی بھی نہ ہو طاقتِ دیدار کسی کی

تم غیر سے ملنے کو کرتی تو ہو لیکن
بھولے سے قسم کھائی ہے سو بار کسی کی

کیا ضبطِ محبت نے گلا گھونٹ کے مارا
فریاد تھی جیسے کہ گنہگار کسی کی

میں پاؤں پہ گرتا ہوں اٹھا ہے فتنۂ محشر
ملتی ہے تری چال سے رفتار کسی کی

رعشہ سا نظر آتا ہے شاخِ گلِ تر میں
لڑنے پہ کلائی جو ہے تیار کسی کی

۲۲۴ ——— ولہ ——— ۴

کیا عاشقِ ناشاد کو وہ شاد کریں گے
آئیگا اگر رحم تو بیداد کریں گے

یہ تیرا ستانا بھی بہت یاد کریں گے
یا ظلم ترا برسوں دلِ ناشاد کریں گے

جب وہ کوئی طرزِ ستم ایجاد کریں گے
یاد آؤنگا میں تجھکو بہت یاد کریں گے

رہ جائیگی بات اور نکل جائیگا پیابر
اے پیرِ مغاں ہم تجھے کیا یاد کریں گے

۲۲۵ ——— مفعول مفاعیلن دوبار ——— ۱۸

یارانِ سخن گو سب اہلِ نظر ہیں اہلِ دل
اس بزم میں تو لیکن بیدل نظر آتا ہے

۲۲۶ ——— فعلاتن مفاعلن فعلات ——— ۱۹

ہوں جو مہمان رات بھر کے لئے
حشر برپا کریں سحر کے لئے

سوزِ دل کیا بجھے کہ آپ آئے
آگ لینے کو لمحہ بھر کے لئے

جتنے عشوے تھے چشمِ ساقی میں
او تنے ساغر حباب کر کے لئے

تیری زینت گہر سے کیا ہو گی
آبرو ہو گئی گہر کے لئے

پہلے جو دامن و گریباں تھا
اب ہے رومال چشمِ تر کے لئے

پہلے ہاتھوں سے تھامتا تھا جگر
ہاتھ ملتا ہوں اب جگر کے لئے

دمِ رفتار حشر نے اٹھ کر
قدم اوس شوخ فتنہ گر کے لئے

کیوں لگائی ہے ڈاب کافی تھا
ایک چھلا تری کمر کے لئے

نزع میں بھی تجھے ہر طرف دیکھا
آپ آئے نہ لمحہ بھر کے لئے

تم تو سمجھے تھے زیست ہی کو عذاب
لاکھ ہیں آفتیں بشر کے لئے

شب کے کنگروں پہ نالوں نے
ٹھوکریں کھائی ہیں اثر کے لئے

ذرا بھی آئے جو بزم میں ساقی
رہنے دینا نظر گذر کے لئے

سر کو رکھے ہوں خاکِ در پہ تری
کہ یہ ضد لی ہے دردِ سر کے لئے

کیا تعصب ہو گیا اگر دیکھا
دل تڑپتا تھا اک نظر کے لئے

نگہ التفات جس کی ہو
اوس کا بندہ ہوں عمر بھر کے لیے

موت کا ڈر تو کچھ نہیں لیکن
زاد رہ چاہیئے سفر کے لیے

بے سروپا جو ہو کرے کیا فکر
پاؤں کے واسطے کہ سر کے لیے

کبھی کھلنا کلی کو ہو نہ نصیب
بند مٹھی رہے جو زر کے لیے

ہجر کی رات ہے یہ رات اے نظم
منتیں مانیے سحر کے لیے

۲۲۷ ——— ولہ ——— ۱۵

راز افشا کہیں نہ ہو جائے
فتنہ برپا کہیں نہ ہو جائے

حب دنیا کہیں نہ ہو جائے
دیکھ سودا کہیں نہ ہو جائے

کون واعظ کے منہ لگے جا کر
مفت جھگڑا کہیں نہ ہو جائے

خون دل آتے آتے اسکو نہیں
تھوڑا تھوڑا کہیں نہ ہو جائے

دیکھ لے آنکھ بھر کے دنیا کو
یہ تماشا کہیں نہ ہو جائے

خواب مرقد میں بھی یہ دھڑکا ہے
حشر برپا کہیں نہ ہو جائے

ضبط نالے نہ کر دل بیمار
درد پیدا کہیں نہ ہو جائے

بڑھتے بڑھتے یہ کاکل شب رنگ
شب یلدا کہیں نہ ہو جائے

ناز کو ہے خیال پردہ دری
کوئی رسوا کہیں نہ ہو جائے

نہ لب بام مجھ کو ڑلواؤ
لب دریا کہیں نہ ہو جائے

پھر نہ چہرے پہ چھوڑیئے زلفیں
پھر اندھیرا کہیں نہ ہو جائے

شام ہی سے سحر کا ذکر نہ کر
دل کو دھڑکا کہیں نہ ہو جائے

دل پرسوز پر نہ رکھو ہاتھ
ید بیضا کہیں نہ ہو جائے

صاف ہے چاندنی نہ الٹو نقاب
چاند دھبا کہیں نہ ہو جائے

اتنا دعویٰ نیاز کا اے نظم
ناز بیجا کہیں نہ ہو جائے

۲۲۸ ولہ ۱۳

طرز دکھلا دے اوس کی قامت کے
پاؤں پڑتا ہوں میں قیامت کے

دن نہ گنئے اگر مصیبت کے
ہم تھے مہمان چند ساعت کے

میرا ساغر رہا نہیں خالی
صدقہ ہو جاؤں اس کی رحمت کے

دل لگا کر کوئی سنے تو کہوں
جو فسانے ہیں دل کی حسرت کے

وقت پر تم نے لی خبر ورنہ
مر گئے ہوتے ہم تو مدت کے

گر نہیں ہے ریا تو رندوں میں
ہیں یہ آثار اہل جنت کے

مشت خاک اور ہما ہمی ایسی
کارخانے ہیں تیری قدرت کے

اے صبا تذکرہ وطن کا نہ کر
رہنے والوں سے دشت غربت کے

فاتحہ پڑھ کے لی جو ٹھنڈی سانس
جھلملائے چراغ تربت کے

کھل گیا راز دل کہ مدفن پر
پھول نکلے جگر کی رنگت کے

اگر گوش گل تک رسا ہو گئی
تو شبنم در بے بہا ہو گئی

مری اسباب صبا ہو گئی
ابھی آئی تھی پھر ہوا ہو گئی

تھی فرصت عمر یا شمع تھی
ذرا جھلملائی فنا ہو گئی

ہو حکم مبرم کہا اس نے کش
عیاں شکل ماسوا ہو گئی

ساہوں سے رندوں کے ظلمت جو تھی
سمٹ کر وہ کالی گھٹا ہو گئی

گرد قافلہ تک پہونچنے میں گرد
بہت دور بانگ درا ہو گئی

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
غضب ہے جو غفلت ذرا ہو گئی

ہے آپس میں اب تو فساد و نفاق
محبت وہ اگلی ہی کیا ہو گئی

گری تھی ابھی برق بن کر نگاہ
ابھی گر کے تیغ قضا ہو گئی

نظر کا نظر سے لڑانا تھا
لڑائی کی اس پر بنا ہو گئی

زیادہ تمنا بھی اچھی نہیں
اجل آتے آتے خفا ہو گئی

ہوئی ہاتھ ملتے ہی ملتے فنا
جوانی تو رنگ حنا ہو گئی

۲۳۱ — فاعیل مفاعلن مفاعیل — ۱۰

بدعت مسنون ہو گئی ہے
امت ملعون ہو گئی ہے

کیا کہنا تری دعا کا زاہد
گردوں کا ستون ہو گئی ہے

رہنے دو اجل جو گھات میں ہے
مجھ پہ مفتون ہو گئی ہے

حسرت کو غبارِ دل میں ڈھونڈھو
زندہ مدفون ہو گئی ہے

وحشت کا تھا نام اوّل اوّل
اب تو وہ جنون ہو گئی ہے

واعظ نے بری نظر سے دیکھا
مے شیشہ میں خون ہو گئی ہے

عارض کے قرین گلاب کا پھول
ہمرنگ کی دون ہو گئی ہے

مل کر دیو و ملک کی سیرت
طرفہ معجون ہو گئی ہے

بندہ ہوں ترا زبان شیریں
دنیا ممنون ہو گئی ہے

حیدر شبِ غم میں مرگِ ناگاہ
شادی کا شگون ہو گئی ہے

۲۲۰ —— تضمین دعائیہ —— ۱۴

فلک مطیع رہے بخت سازوار رہے
اساسِ دولت و اقبال پائدار رہے

بلند اوجِ منزلت و جاہ برقرار رہے
ہمیشہ خلق میں شہرہ ترا وقار رہے

نبی کا لطف رہے فضلِ کردگار رہے

فروغِ مہر پہ چشمک کرے نگینِ دکن
چمک سے جس کی فروزندہ ہو جبینِ دکن

فلک پہ سنبلہ ہو جائے خوشہ چینِ دکن
عروج پائے ترے دم سے سرزمینِ دکن

ترے قدم کا سرِ آسمان غبار رہے

اسی طرح سے رہو اوج موجِ شوکت میں
اسی طرح سے رہو بہرہ ور دولت میں

یونہی نسیمِ طرب گل فشاں ہو صحبت میں
خزاں نہ آئے کبھی تیرے باغِ عشرت میں

هرچند که گردون پی من جور و جفا داشت
از فکر بیا سود دل من که خدا داشت

تا عکس تو دا افگند بشوخی و روان شد
آئینهٔ او حیرت نقش کف پا داشت

در دست حنابستهٔ او دزد حنا بود
ایں دزد ندانم ید بیضا ز کجا داشت

خون حیثی و عربدها کردی و شادم
دانم که بریں کار ترا ناز و ادا داشت

چون قافلهٔ پیهم خرد و هوش روان شد
رنگینه پرید از رخ من بانگ درا داشت

فریاد ازیں عاقبت طالب دنیا
میرفت بسوئے عدم و رو بقفا داشت

آں طائر ناداں که بقید قفس آمد
بے چاره ندانست که در پیش چها داشت

دل دوخته ناوک کشش مژهٔ جادو
دنبالهٔ او ره ز کجا تا به کجا داشت

در دولت ایں خسرو عادل عجب اینست
دیدم صف مژگاں که دو صد فتنه بپا داشت

بستم و ایں مطلع برجسته بجوا نازم
جیش شه ذیشاں که لقب ظل خدا داشت

۳۱۴ —— (مطلع) —— ۱۱

صد لطف بهر عاجز و مسکین شه ما داشت
شه دست کرم داد و او دست دعا داشت

هنگام تکلم لب لعلش گهر افشاند
هر گوهر غلطاں بگره آب بقا داشت

صد نکته فزوده است بدیوان سخن‌ها
صد عقده کشوده است بفکری که رسا داشت

آوازه شنیدیم و دو دیدیم ببویش
سنگ در او منزلت کوه صفا داشت

تا رایت اقبال تو بر اوج ظفر تافت
افشاند براهش پر و بالے که هما داشت

تا عدل شهی مژده امنے بجهاں داد
تا بسته گردوں که سر جور و جفا داشت

از نکہتِ عشق ملکِ دکن تازہ جواں شد
شمشیر و کمر داد بہ پیرے کہ عصا داشت

تا معدلتش دستِ ضعیفاں بہ گرفتست
دیدیم پرِ کاہے کششِ کاہربا داشت

تا از نفحت بادِ بہاری بوزیدست
گلزارِ دکن از سرِ نو نشو و نما داشت

(بدخواہ تو گشت است چناں عاجز و رسوا
دیدند کہ او پایۂ گل و سر بہ ہوا داشت)

صد بار دم از ناز و تفاخر بزند نظم
بارے بہ صفِ حاشیہ بوسانِ تو جا داشت

۲۴۵ (نظام گزٹ سے منقول ہوا) ۷

اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اپنے پروردگار کی نعمت کا ذکر کرو

اعلیٰ حضرت ظل اللہ کا وجود ذی جود ایسی نعمت ہے جس کی تاریخ اوراقِ روزگار و صفحاتِ قلوب پر ابدالآباد تک نقش رہے گی جن کی نعمتوں کی برکتوں کا شمار و احصار زبان و قلم کے حیطۂ امکان سے باہر ہے یہ ترانہ سالگرہ با امتثالِ امرِ باری زبان قلم پر جاری ہوا۔

آٹھ معین قافیوں میں سات شعر کی قید تھی

(حیدر یار جنگ سید علی حیدر نظم طباطبائی)

جوشِ گل جوشِ طرب جوشِ بہار است اینجا
گل فشاں نغمۂ زمنقارِ ہزار است اینجا

از چراغاں شدہ ہر کوچہ و برزن پر نور
کہکشاں جادۂ ہر راہ گزار است اینجا

شعلہ و رشتۂ شمع است بہم پیوستہ
تاج زرّیں ز طرب بر سر خار است اینجا

من کہ در ظلّ خدا نور خدا می بینم
چشم بر ہم زنم جلوۂ یار است اینجا

شام یک مژدۂ امن است و سحر مژدۂ عیش
ہر دو یک اند مگو لیل و نہار است اینجا

شب این جشن و فلک عقد ثریا در دست
یعنی این سلک گہر بہر نثار است اینجا

نغمۂ نظم کسی بار دریں بزم عجب
مجمعے خوش ز امیران کبار است اینجا

٢٣٦ ملمع ٢٣

وارفتۂ حرف حق ہیں اہل توفیق
ہر موعظۂ پیر طریقت سمجھو

خنظل بھی جو ہو تو جانتے ہیں مصری
طبتم اخذتم علیہا اصری

رباعی

سالک کو فروتنی سے کب چارہ ہے
سالک وہ نہیں جو محو نظارہ ہے

دیکھو آنکھیں جو دونوں نیچی کر لیں | پہلے جو ستارہ تھا وہ سیارہ ہے

رباعی

آئینہ سے نیک نام اسکندر ہے | آئینہ جڑا ہوا انگوٹھی پر ہے
نام اس کا اسی نگینہ پر ہے کندہ | شاہی کا نگیں ہے نہ اب انگشتر ہے

رباعی

جو ظلم کئے تھے وہ ذرا سہہ تو سہی | انصاف خدا کے ہاتھ ہے دل تو سہی
مظلوم بھی ہے اور محشر بھی ہے | ظالم نطقاً و سیفاً اب کہہ تو سہی

رباعی

جو معنی بستہ ہیں سب بند حقے ہیں | سب بند حقے ہیں مضمون عجب بند حقے ہیں
میں کلم سخن اس سے ہوں کہ شیریں ہی کلام | کھلتی ہے اگر زبان تو لب بند حقے ہیں

رباعی

دل کی حرکت کو اضطراری سمجھو | یہ طائر جاں کی بیقراری سمجھو
ہے عمر فقط چند نفس کی میعاد | جینے کو فقط نفس شماری سمجھو

رباعی

دنیا اک ہولناک ویرانہ ہے | اور طول امل فسون و افسانہ ہے
لالچ سے حذر چاہیئے غصہ سے گریز | وہ خوک ہے اور یہ سگ دیوانہ ہے

رباعی

رباعی

افلاس میں اسلاف کی عزت تو ہے | زر پہ کے گر گلوں میں نکہت تو ہے
ہر حال میں اخلاق کریمانہ رکھ | دولت تو نہیں رہی شرافت تو ہے

رباعی

دعویٰ ہم کو یہ ہے کہ لائق ہم ہیں | بے علم و کمال سب پہ فائق ہم ہیں
کہتی ہے مگر ہماری تن آسانی | خود اپنے لئے مانع و عائق ہم ہیں

رباعی

سودا ہے ہزار طرح کا سر ہے ایک | خطرے لاکھوں ہیں اور خاطر ہے ایک
حرص۔ آز حسد عجب غضب جہل ہوس | ساتا رہزن ہے اور مسافر ہے ایک

رباعی

ظاہر میں تو خاطریں مداراتیں ہیں | دل میں بیٹھا ہی چور اور گھاتیں ہیں
باقی نہیں ہم میں اتفاق کلمہ | جتنے منہ ہیں بس اتنی ہی باتیں ہیں

رباعی

کچھ دخل کوئی فہم کو دیتا ہی نہیں | اب تک نا فہمیوں سے چیتا ہی نہیں
ہر بات ہی تیری میری دیکھا دیکھی | اب عقل سے کوئی کام لیتا ہی نہیں

رباعی

غافل ہیں ہمیں فکر پس و پیش نہیں | یعنی کہ مقدّر ہیں کم و بیش نہیں

سو مرتبہ حادثوں نے کھولی ہے آنکھ   اب بھی نظر عاقبت اندیش نہیں

رباعی

ایسا بھی کہیں حد سے گزر جاتے ہیں   جو دل میں آگئی وہ کر جاتے ہیں
اچھے نہیں اطوار ہمارے اے نظم   لوگ ایسے ہی جوان مر جاتے ہیں

رباعی

دریا میں ہوں اور اہل نظر پیاسا ہوں   پہلے سے بھی اب تو بیشتر پیاسا ہوں
سچ کہتے ہیں آبِ شور ہے یہ دنیا   میں ڈوب کے مر گیا مگر پیاسا ہوں

رباعی

ہر عضو بدن نزع میں گھل جائے گا   یہ جسم کہیں خاک میں مل جائے گا
تا زیست تو کی ہے پردہ داری تم نے   مرقد میں مگر خضاب کھل جائے گا

رباعی

میں تا لبِ گور عمر بھر میں آیا   دم میرا لبوں پہ اس سفر میں آیا
اس طرح سے پیری نے مروڑا مجھ کو   جو زلف میں خم تھا وہ کمر میں آیا

رباعی

جس کو نہ غم مآل اصلا ہوگا   پھر خاک اُسے اندیشۂ فردا ہوگا
کیفیت حال میں ہر اک شخص ہے مست   یہ فکر نہیں کسی کو اب کیا ہوگا

رباعی

گو اب نہیں مال و جاہ و دولت باقی | باقی ہے خدا اور اس کی رحمت باقی
سو مرتبہ ہو جائے زوالِ نعمت | سب کچھ باقی ہے گر ہے ہمت باقی

رباعی

کیوں سو رہے جا کے گور کی منزلیں | خالی تھی جگہ ان کے لیے تو دلیں
کچھ شعر لکھے تھے وہ سنانے اے نظمؔ | افسوس کہ میکش نہیں اس محفل میں

تاریخیں

تہنیت عقد ثانی اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

ہے آج جشن کہ سرکار عقد میں لائے | عروس آئینہ رخسار و ماہ سیما کو
زہے شکوہ سلیماں کو مل گئی بلقیس | زہے فروغ کہ یوسف نے زلیخا کو
تو جا کے بزم میں اے نظمؔ عقد کی تاریخ | یہ عرض کر کہ مبارک حضور والا کو
(۱۳۴۱ھ)

تاریخ تعمیر کتب خانہ آصفیہ

بنا نمود کتب خانہ آصف ہفتم | رساند ذروۂ اعلیٰ بہ اوج مہر منش
نوشت نظمؔ دعا گو چو دید بنیانش | کہ ہٰذہ الکتب القیمہ ست تاریخش
(۱۳۲۹ھ)

تاریخ ترجمۂ وکار آف ویکفیلڈ

ترجمہ اردو میں انگریزی فسانہ کا ہوا | واقعی باتیں لباسِ استاں پہنے ہوئے

ایک مصرع میں ہوئی تقریظ بھی تاریخ بھی | ہے فرنگن زیورِ ہندوستان پہنے ہوئے
(۱۳۰۲ھ)

تاریخ طبع دیوان میر ذاکر حسین یاس مرحوم

ہر شعر سے حسن خوش بیانی نکلے | ہر لفظ سے لطف نکتہ دانی نکلے
اے نظم چھپے نہیں یہ اشعار تمام | پتھر سے چشمہ معانی نکلے
(۱۳۰۶ھ)

تاریخ ولادت نواب شہنواز جنگ بہادر

کیا ستارہ سا پسر حق نے دیا | حسن میں ہے غیرت ناہیدیہ
دایہ سے حیرت میں ہاتف نے کہا | آگیا ہے گود میں خورشید یہ
(۱۳۱۲ھ)

تاریخ مثنوی ضیائے دکن

جناب مولوی باقر حسن نے | لکھے کیا پر ضیا و روشن اشعار
مضامین انکے سب ہیں دُرِ غلطاں | قلم کا ہے سوادِ ابرِ گہر بار
یہ شیرازہ ہے یا موتی گندھے ہیں | خجل ہے عقد مروارید کا تار
ہوا ہے نظم یہ مصرع تاریخ | یہ سب اشعار ہیں لولوی شہوار
(۱۳۰۸ھ)

تاریخ دیوان حبیب کنتوری مرحوم

چھپ گیا کیا خوب دیوان حبیب | سب سخنور محوِ نظارہ ہوئے
نظم میں نے طبع کے گن کر سنین | کہہ دیا تیرہ سے اٹھارہ ہوئے
(۱۳۱۸ھ)

تاریخ دیوان نواب نوصاحب رفعت مرحوم

فکر رفعت کی بلند اور طبیعت رنگین | کہنا اس طرح ہے تابوں میں جسے کہتے ہیں

اونکے دیوان کی تاریخ یہ لکھی میں نے	سحر ایسا ہو اس اردو میں جسے کہتے ہیں

(۱۳۲۲)

مجھے ہمیشہ سے تاریخ کہنے سے انکار ہے تاریخ فن شعر میں داخل نہیں ہے مگر مجبور ہو کر کہہ بھی لیتا ہوں نواب عزیز یار جنگ بہادر مرزا داغ مرحوم کے ایک خوش فکر شاگرد ہیں میرے پاس آئے اور اپنے دیوان کی تاریخ کہنے کے لئے مجبور کیا میں نے یہ مصرع کہا:-

"داغ کا انداز اس دیوان میں ہے"

(۱۳۳۶)

تاریخ وفات نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم

بسکہ ہے آبستن[۱] موت و حیات	حیف یہ عبرت کدۂ ایرماں[۲]
جو کوئی اس دار فنا سے گیا	پھر کے نہ آیا وہ کبھی پھر یہاں
اوٹھ گیا اس بزم سے حیف اک ایسا	باذل و ذی رتبہ و والا مکاں
رہ گیا نیکی کا زمانہ میں ذکر	مٹ گیا ایثار و کرم کا نشاں
غم سے برا حال ہے احباب کا	درد و الم دل میں ہے لب پر فغاں
نام بھی مرحوم کا تاریخ بھی	ہیں اسی اک بیت سے دونوں عیاں

معتمد الدولہ بہادر نے ہائے

کوچ کیا سوئے نعیم جناں

(۱۳۲۸)

---

۱ - آبستن بمعنی حاملہ ۲ - ایرمان بمعنی عاریت ۱۲

تاریخ وفات علی فرزند سید محمد تقی صاحب

ماں باپ کی آنکھوں میں تھی تیرہ و تاریک
ذی الحجہ کی ستر ھویں رحلت سے علی کی
افسوس کہ بس اک سال اور آٹھ مہینے
کیا گھر میں اُجالا تھا طلعت سے علی کی
اس واقعہ کی اے نظم فصلی ہے یہ تاریخ
اندھیرے دنیا میں فرقت سے علی کی

(۱۴۴۰) — (۱۱۰۱)

تاریخ وفات استاذ علامہ جناب قائمۃ الدین رحمہ اللہ تعالیٰ

مَاتَ الفَقِیہُ الالمعِیُّ المقتدیٰ
وقد استباح الکنز مِنْ عُلیا التقیٰ
مذلم یزل للدین قائمۃ و رکن
للھدایۃ والزمان بہ اقتدیٰ
فنجوم اوجبات الشریعۃ قد ھوت
وَسِراجُ اَنوارِ الھدایۃ قد خبیٰ
ارَّختُ عام الارتحال بمصرع
لتزلزلت واللہ ارکان الھدیٰ
(۱۲۹۸ھ)

عبارت خاتمہ

یہ سب غزلیں مشاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا۔ ردیفیں پوری نہیں ہیں اور الف بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں غزل میں مقطع کا ہونا نہ ہونا میرے نزدیک یکساں ہے دیوان برسوں سے مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت اب آیا ہے۔ میں نے پھر سرے سے آخر تک ایک نظر ان غزلوں پر ڈالی اور اکثر مقاموں میں تغیر و تبدیل بھی کی ہے۔ میری اردو بھی فارسی سے کم نہیں ہے میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیں ان غزلوں میں جا بجا معشوقانہ اداؤں کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں۔

خدا ظاہر پرست و رہباں منش لوگوں کی نظر بد سے اس نگارستان معانی کو بچائے!

مقصورات فی الخیام کامثال اللؤلؤ المکنون

جعلناهن ابكاراً عرباً اترابا

ڈیروں میں رہنے والی غزال چشم عورتیں (اعرابیّہ بدویّہ) گویا کہ وہ درمکنون ہیں ہم نے ان کو کواری چاہنے والی سہیلیاں بنایا ہے۔

علی حیدر طباطبائی

کتبہٗ محمد عبدالستار کاتب مکتبہ ابراہیمیہ

۱۴	۱۷	اس قدر لی چٹکیاں	
۱۵	۱	ہوئی الجھن بڑا	
۱۷	۷	شُعاع	
۲۲	۴	وحوت	
۲۸	۲	کب اُس	
"	۷	(۱۷) ولہ	۱۱
۳۳	۱۲	نہس یک	
۳۴	۳	ہوا	
۳۵	۷	اُٹھی	
۳۹	۱	x	
"	۹	مجھ کو	
"	۱۴	جو یارانہ	
"	۱۵	دست چڑہا	
۴۱	۷	میں	
۴۳	۱۲	ناز ہے	
۴۵	۷	آہوں	
"	۹	ڈھلنا	

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۹	۴	عمش بیا ما ہم	عشقش بیا سایم
"	۸	ہم ست	ہم است
۸۲	۴	لہ	کہ
"	۱۱	میست	نیست
"	۱۶	حکاتے	حکایتے
۸۴	۵	بال وپری	بال پری
"	۱۴	غرض	عرض
۸۵	۴	۱۹	۱۱
۸۶	۱	کیطرح زہیں	کیطرح ولہ زہینہ
۸۷	۲	دوربش	دورباش
"	۱۱	سوال	سوال
۸۸	۳	مشک وبو	مشک بو
۸۹	۵	کشتی	کشتی
"	"	صد	پسر
۹۰	۹	دست ویا	دست وپا
"	۱۳	مائم	مائیم
"	"	ماگھر	مابہ گھر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۱	۱۵	نفس	نفس امارہ
۹۳	۵	تھی	تھے
"	"	حلاحل	جلاجل
۹۶	۷	نغزش	لغزش
"	۶	تعزبر	تعزیر
"	"	حسینونکے	حسینوں کے
۹۹	۹	پہرا	پہرا
۹۹	۱۱	ڈھلجانے	ڈھل جانے
۱۰۰	۵	ہیں	ہیں
۱۰۰	۶	افسانہ پہ پھر	افسانہ پر
۱۰۰	۱۵	یا نہیں	یا نہیں
۱۰۲	۱۱	پروانہ	پروانوں
۱۰۴	۲	کہ سی	کہ اسے
"	۶	آگے	آکے
۱۰۵	۱۴	پھر سر	تیر پہ
۱۰۶	۱۳	آوازہ	آواز
"	۴	ارسی	آرسی

۱۰۷	۹	صیرے	صیرشے
۱۱۶	۱	کہیں	کھلیں
〃	۶	گرثاب	گرداب
۱۱۷	۱	جیں بشہر	دیں سپ بیشہ
〃	۱۷	گرہاں لیطرف	گریباں کیطرف
۱۹	۶	اودھر	اُدھر
〃	۱۶	چاہ و پیار	چاہ پیار
۱۲۰	۱	ررزخ	برزخ
〃	〃	لگا	رگا
	۴	پڑھ گئے	پڑ گئے
〃	۱۷	رفتی	رُفتی
۱۲۱	۱۰	تشنہ لیلا	تشنہ لبیا
〃	۱۴	بکشم	بکشتم
۱۲۳	۹	چاہ و پیار	چاہ پیار
۱۳۱	۶	وسانپ	دو سانپ
〃	〃	تھائی	کھاتے
〃	۱۷	باندھے ہو	باندھے رہو

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴۵	۱۱	تحقق	تحقیق
〃	۱۲	نشترہ	نشتریہ
〃	۱۶	کعبہ و غبر	کعبہ منبر
۱۴۷	۶	سکوسن	سکون
۱۴۸	۲	وہی حھلاسی کمری کی نہیں	وہی چھلاسی کمری کہ نہیں
〃	۱۵	سنشان	سنسان
۱۴۹	۳	نگہ مار	نگہ یار
〃	۱۶	فریادو	فریاد
۱۵۰	۳	ماقی	باقی
۱۵۱	۱۷	آرادانہ	آزادانہ
۱۵۲	۱	سنت ہستی کو کیا	منت ہستی کیا
〃	۶	کہ یہ	کہ یہ
〃	۱۵	تو یہ	تو یہ
〃	۱۶	ادا بہوے	ادا بھائے
〃	۱۷	متجب	تعجب
〃	〃	تھر	پتھر
۱۵۴	۷	وہ ہر سو	کہ ہر سو

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۵۵	۱۵	ہی ہی	ہے یہی
۱۵۶	۱۷	عبرت سے	ذرا عبرت سے
۱۵۷	۱	چیڑھتے	چڑھتے
۱۶۱	۲	درو گوہر	زر و گوہر
"	۶	ہونکہ	ہوں کہ
"	۸	ٹہراے	ٹھہرئے
۱۶۳	۵	درویش وعی	درویش و غنی
۱۶۴	۵	ھربدہ	عربدہ
۱۶۵	۸	زوگھر	ہو گھر
۱۶۶	۲	مضر	مضر نہیں
۱۶۸	۱	ملال برق	ملال و برق
"	۱۱	ریک	رنگ
۱۷۲	۳	نبرش	بہ برش
"	۱۵	میرے	میں ہے
۱۷۶	۱۵	یہی	یہی
۱۷۸	۱۶	خیر بھی سے	خبر بھی ہے
۱۷۹	۱۱	دور سے	درد سے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸۱	۱۱	رضع	رضیع
"	۱۴	ہیں زمانے	ہیں سامنے
۱۸۵	۲	تری	تیرے
۱۸۷	۱	دود آھ	دود آہ
"	۱۱	توڑتا	توڑنا
۱۸۸	۱۶	وہ	جو
۱۹۱	۶	حبص بیص	حیص بیص
"	۹	ہوئے	ہوائے
۱۹۲	۴	آزاد بھی	آزاد بھی
۱۹۳	۱۶	کی مسافت	کی بھی مسافت
۱۹۵	۳	سدیرو خوزنق	سدیرو خورنق
۲۰۰	۸	نگھ	نگہ
۲۰۵	۱۵	تیغ نو	تیغ تو
۲۰۹	۵	دمبالہ دار	دمبالہ دار
"	۱۰	بھی میں نشہ	بھی نشہ
"	۱۱	سلمنا	سامنا
۲۱۳	۱۰	بچلے	بچا کے

۲۱۴	۴	فراوانی	سلیمانی
۲۱۷	۱۶	جھٹنے	بھٹنے
۲۱۸	۱۲	خود نمائی ہے کا	خود نمائی کا ہے
〃	۱۶	نمائشی	نمائش ہے
۲۲۶	۱	دے کہ	دے کر
۲۲۸	۱	صدااالٹی	صدا الٹی
۲۳۰	۹	چستم بز	چشم تر
۲۳۸	۸	کرہ	کر
۲۳۹	۹	داد	داد لو
۲۴۴	۷	کرٹیں	کروٹیں
〃	۸	لذت	نخوت
۲۴۵	۱۷	مثل	مثل رقیب
۲۴۷	۷	لدورت	کدورت
۲۴۸	۹	سجے	سمجھ سمجھتے
〃	۱۳	شر	حشر
۲۴۹	۳	کیا	کیسا
〃	۸	وہ	جو

۲۴۹	۱۶	ستوں
〃	۱۷	ہمیں
۲۵۱	۳	چاکر
۲۵۶	۱۰	شک
〃	۱۶	شک
۲۵۷	۹	تو
۲۵۹	۱۵	اونگلیاں
۲۶۰	۵	پلٹنی
۲۶۳	۱۰	دیکھی ہے
۲۶۴	۱۳	حسن
۲۶۵	۱۰	دل کو دہر
۲۶۷	۱	بجی
۲۶۸	۴	سانگیتن
۲۷۲	۱۷	سیہ کاری
۲۷۳	۲	سازسی
〃	۴	فلاف
〃	۱۰	تراز

صفحہ	سطر	غلط	صواب
۲۸۹	۱۷	کہا	کیا
"	"	ہنستا ہے پر اوپر سے	ہنستا ہے اوپر سے
۲۹۰	۱۱	منک	مہ تک
۲۹۱	۶	گتر	گر
"	۱۱	اتنا ہو	اتنا تو
۳۰۰	۱۶	شوحی	شوخی
۳۰۵	۱۱	گلہ	گلا
۳۰۷	۸	پرواز	پرداز
"	۱۴	دل بہ یار	دل بیمار
۳۱۲	۵	مشتل	محفل
۳۱۷	۱۵	طلبتم احذتم علیہا اصری	طلبتم آخذتم علیہم

مطبع انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن پریس